# منیر شکوہ آبادی

## سوانح حیات و کلام

پر تبصرہ

ڈاکٹر زہرا بیگم یاسمین

جملہ حقوق اشاعت بحق نسیم بکڈپو لکھنؤ
محفوظ ہیں

قیمت

[illegible]

بہ اہتمام

نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

ٹیلیفون :- آفس :- ۲۲۵۵۹
رہائش :- ۲۵۲۲۴

ناشر:- عزیز الرحمٰن (بار اوّل نومبر [illegible]) پرنٹر:- الواعظ صفدر پریس لکھنؤ

یہ مقالہ لکھنؤ یونیورسٹی کی پی۔ ایچ۔ ڈی
ڈگری کے لئے ۱۹۶۴ء میں پیش کیا گیا
اور
۱۹۶۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی نے اس پر
مؤلف کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند
عطا فرمائی۔

اپنے والد محترم سید سراج الحسن مرحوم
کے نام
جن کے فیضِ تربیت اور سایۂ عاطفت
نے اس لائق کیا کہ کوئی علمی خدمت
انجام دے سکوں

# فہرست


| | |
|---|---|
| پیش لفظ | ۹ |
| باب اوّل :- سوانح حیات و ماحول | ۱۷ |
| ۱- پیدائش اور خاندانی حالات | ۱۸ |
| ۲- تعلیم و تربیت | ۲۶ |
| ۳- منیر اور شعر و سخن | ۳۲ |
| ۴- منیر اور ان کے قدرشناس | ۳۸ |
| ۵- ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی اور منیر | ۵۶ |
| ۶- منیر اور جزائر انڈمان | ۶۲ |
| ۷- واپسی ہندوستان | ۸۳ |
| ۸- منیر اور قیام رام پور | ۹۱ |
| ۹- وفات | ۹۴ |
| باب دوم :- تصانیف منیر شکوہ آبادی | ۹۷ |
| ۱- دیوان اوّل "منتخب العالم" | ۹۹ |
| ۲- دیوان دوم "تنویر الاشعار" | ۱۰۰ |
| ۳- دیوان سوم "نظم منیر" | ۱۰۲ |
| ۴- منیر بہ حیثیت نثرنگار | ۱۰۹ |

۵۔ شاگردان میر ۱۱۵

باب سوم :۔ دبستان لکھنؤ اور میر شکوہ آبادی ۱۱۹

۱۔ مذہبی رنگ ۱۳۱

۲۔ معاملہ بندی اور خارجیت ۱۳۲

۳۔ تشبیہات و استعارات ۱۳۴

۴۔ پُرگوئی اور قادر الکلامی ۱۳۵

۵۔ زباں دانی اور شستہ بیانی ۱۳۶

باب چہارم :۔ میر کی غزلیات اور قطعات تاریخ ۱۴۲

(الف) میر بہ حیثیت غزل گو ۱۴۶

۱۔ تصوف و اخلاق ۱۴۸

۲۔ مذہبیت اور عقیدت ۱۵۱

۳۔ رعایت لفظی ۱۵۲

۴۔ واقعہ نگاری و معاملہ بندی ۱۵۳

۵۔ تشبیہات و استعارات کا روایتی استعمال ۱۵۴

۶۔ کلام میں سوانح حیاتی اشارے ۱۵۴

۷۔ حسن ادا، مضمون آفرینی اور دلکش انداز بیان ۱۵۷

۸۔ ماہرانہ فن کاری اور علمی و مقامی اصطلاحات ۱۵۹

۹۔ الفاظ کا برمحل صرف، لطف زبان و حسن محاورہ ۱۶۱

۱۰۔ حسن تغزل ۱۶۲

(ب) منیر کی رباعیات اور تاریخی قطعات ۱۶۶

باب پنجم:- منیر اور مثنوی نگاری ۱۷۷

منیر کی مثنویاں ۱۸۰

(الف) مثنوی "حجاب زناں" ۱۸۰

۱۔ واقعہ نگاری ۱۸۷

۲۔ معاصرانہ زندگی اور اس کی عکاسی ۱۹۰

۳۔ مکالمہ نگاری ۱۹۱

۴۔ سادگی و سلاست ۱۹۲

۵۔ الفاظ کا برمحل صرف روزمرہ اور محاورہ ۱۹۳

(الف ۲) مثنوی "معراج المضامین" ۱۹۵

۱۔ سبب تصنیف اور مختصر جائزہ ۱۹۶

۲۔ ماخذ مثنوی، ترتیب مثنوی ۱۹۸

۳۔ مثنوی نگاری میں منیر کا مقام ۲۰۰

باب ششم:- منیر کی قصیدہ نگاری ۲۰۸

(الف) صنف قصیدہ اور اردو کے ممتاز قصیدہ نگار ۲۰۸

(ب) منیر کے قصائد کی تفصیل و تشریح ۲۱۷

(د) منیر کے قصائد کی خصوصیات ۲۱۸

۱۔ سوانح حیاتی اشارے ۲۲۰

۲۔ معاصرانہ عہد کی عکاسی اور سیاسی حالات ۲۲۰

| | |
|---|---|
| ۳۔ سنگلاخ زمینیں، مشکل ردیف و قافیہ | ۲۲۳ |
| ۴۔ رعایت لفظی و مرصع کاری | ۲۲۵ |
| ۵۔ علوئے تخیل اور پرواز فکر | ۲۲۶ |
| باب ہفتم :۔ منیر اور فن شعر گوئی | ۲۲۴ |
| ۱۔ منیر کا نظریۂ شاعری | ۲۳۴ |
| ۲۔ ہماری شاعری میں منیر کا مقام | ۲۶۰ |
| ۳۔ منیر کی اہمیت و عظمت | ۲۹۴ |

# پیش لفظ

منیر شکوہ آبادی پر ابھی تک باقاعدہ طور پر کوئی کتاب نہیں شائع ہوئی تھی۔ البتہ متعدد مضامین لکھے گئے ہیں۔ اُردو ادب میں مدّت سے اس کمی کو محسوس کیا جا رہا تھا کہ منیر شکوہ آبادی کی شاعری کا مفصل جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں ۱۹۶۰ء سے منیر شکوہ آبادی پر تحقیقاتی کام شروع کیا اور اس کام کو ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل شعبۂ فارسی اُردو کی نگرانی میں پایۂ تکمیل کو پہنچانے کے لئے مسلسل تین سال کافی چھان بین سے کام لینا پڑا۔

اس مقالے کے لئے مواد کو فراہم کرنے کے واسطے میں نے سب سے پہلے رامپور کا سفر ۱۹۶۱ء میں کیا۔ وہاں تقریباً ایک ہفتہ قیام کیا۔ اس آٹھ دن کے عرصہ میں گورنمنٹ لائبریری رامپور سے کافی مواد فراہم ہوا اور منیر شکوہ آبادی کی داستان کی کتاب "طلسم گوہر بار" (قلمی) نظر سے گزری۔ اس لائبریری میں جناب امتیاز علی عرشی صاحب نے میری بہت مدد کی اور جناب عابد رضا صاحب ڈپٹی لائبریرین نے بھی اپنا قیمتی وقت میرے ساتھ صرف کر کے مجھے کتابیں مطالعہ کے واسطے دیں۔ رامپور کے علاوہ اسی کام کے سلسلے میں دوبار علی گڑھ گئی اور وہاں کی لائبریری میں چھان بین کرنے سے کچھ مواد فراہم ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں جب دوبارہ علی گڈھ گئی تو جناب آل احمد سرور سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے بھی اپنی قیمتی رائے سے

سرفراز فرمایا۔ میں ان سب حضرات کی بے حد ممنون ہوں۔

آخر میں مقالہ لکھنؤ یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند کے لئے منظور کر لیا اور اس پر مجھے ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔

مقالہ کا موضوع چونکہ "منیر شکوہ آبادی" ہے۔ اس لئے باب اول میں منیر کی سوانح حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ منیر ۱۲۲۹ھ میں بمقام شکوہ آباد پیدا ہوئے۔ زمانے کے رواج کے مطابق تعلیم و تربیت پائی اور میدان شاعری میں قدم رکھا۔ ناسخ۔ رشک اور مرزا دبیر کی شاگردی کی اور تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ پہلی غزل جس کا مطلع ہے

دنیا سے ہے باہر دل دیوانہ کسی کا
بستی میں سماتا نہیں ویرانہ کسی کا

کو پڑھ کر اور خاص طور سے اس کے مقطع کو پڑھ کر منیر کے جو تیور ہیں اس سے ان کی تعلّی کا اندازہ ہوتا ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نو آموزی اور نو مشقی کے زمانے سے خود اعتمادی اور شاعرانہ تعلّی موجود ہے۔

منیر نے اپنی زندگی شکوہ آباد، آگرہ، لکھنؤ، فرخ آباد، باندہ، انڈمان، الہ آباد اور رامپور میں گزاری۔ کلکتہ اور مرشد آباد بھی گئے تھے۔ جہاں بھی وہ رہے یا گئے وہاں کا تذکرہ ان کے کلام میں موجود ہے۔ پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک باندہ میں رہے۔ وہیں سے غدر کے سلسلے میں پکڑے گئے۔ رہائی ملنے بھی نہ پائی تھی کہ "نواب جان" طوائف کا قتل ہوا اور اس کا الزام منیر کے سر آیا۔ غدر کے سلسلے میں سرکار برطانیہ منیر سے بدظن تھی ہی چنانچہ قتل کے الزام میں ان کو سزائے حبس دوام ہوئی اور انڈمان بھیجے گئے۔ منیر کو انڈمان میں ذہنی اور جسمانی سینکڑوں تکلیفوں کا سامنا پڑا۔ وہ

کسی نہ کسی صورت سے وہاں زندگی گزارتے رہے۔ حتیٰ کہ ہندوستان میں فضل و کمال کے قدرشناسوں کی محفلوں میں ان کی یاد از سر نو تازہ ہوئی اور نواب رامپور یوسف علی خاں کی کوششوں اور خود منیرؔ کی نیک چلنی کے باعث ان کو جزائر انڈمان کے شدائد اور مصائب سے ۲ صفر سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق جون سنہ ۱۸۶۵ء بروز شنبہ نجات ملی۔

ہندوستان واپس آنے پر کچھ دن پریشان حال رہے مگر کچھ عرصہ بعد رامپور بلا لئے گئے۔ وہاں ان کو سکون و آرام ملا اور زندگی کے آخری ایام کسی قدر آرام و آسایش سے گذار کر سنہ ۱۲۹۷ء میں دنیا سے کوچ کر گئے۔

باب دوم میں منیرؔ کی تصانیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے کلیات میں تین دواوین، دو مثنویاں یعنی "حجاب زنان" اور "معراج المضامین"۔ ایک تنقیدی کتاب "سنان دل خراش" اور ایک داستان "طلسم گوہر بار" موجود ہیں۔ نثر کی دونوں کتابیں قلمی ہیں۔ پھر دواوین پر مختصر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ منیرؔ کے تین دیوان گویا تین خم خانے ہیں جن میں بادہ قدیم شراب قرینہ سے مختلف شیشوں میں بھر کر رکھ دی گئی ہے۔ دیوان اپنی اہمیت اور رنگا رنگی کے لحاظ سے آپ اپنی مثال ہے اور اپنے زمانے کی معاشرت اور علمی و ادبی رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ ان کے تیسرے دیوان میں کچھ خطوط اور کچھ مضامین نثر بھی شامل ہیں۔ چنانچہ ان کی نثر پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ صرف اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ اچھے نثار بھی تھے۔ منیرؔ نے اپنے مخصوص شاعرانہ رنگ میں جو شہرت حاصل کر لی تھی اور اس سلسلے میں جن شعراء کو ان سے خاص عقیدت

تھی اور جو ان کے حلقۂ شاگرداں میں شامل تھے۔ ان کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

باب سوم میں لکھنؤ اسکول کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ منیر کی شاعری میں لکھنویت کس حد تک پائی جاتی ہے۔ منیر کے یہاں لکھنؤ اسکول کی خصوصیات کے علاوہ اپنا ایک خاص رنگ بھی موجود ہے۔ ان کے کلام کے تبصرے کے سلسلے میں مذہبی رنگ، معاملہ بندی اور خارجیت، تشبیہات و استعارات پر گوئی اور نادر الکلامی اور زبان دانی اور شستہ بیانی وغیرہ کے زیر عنوان کلام کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ اور ان کی فنکاری استادانہ صلاحیت اور شاعرانہ عظمت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ منیر کے کلام کے بغور مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لکھنؤ اور اساتذہ لکھنؤ کے گرویدہ تھے۔

باب چہارم میں اُردو غزل کی خصوصیات کے مختصر ذکر کے بعد منیر کی غزل گوئی پر بحث کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنی غزلیات کو مختلف زمانے میں یکجا کر کے جو تین دیوان مرتب کئے ہیں ان کی تفصیلات اور خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی غزلیات کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سیاسی و سماجی حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں اور زمانے کے انقلابات سے وہ کس حد تک متاثر ہوئے۔ ان کی غزلوں کا بغور مطالعہ اس عہد کی سیاسی تبدیلیوں اور ادب پر اسکے غیر معمولی اثرات کو ظاہر کرتا ہے ساتھ ہی ساتھ ان کی روایت پسندی اور پرانی ادبی قدروں سے محبت کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ اپنے طرزِ کلام کو بدلتے بھی ہیں لیکن نہ اس قدر کہ قدیم روش بالکل نظر انداز ہو جائے۔ اس باب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ منیر کو قطعات تاریخ لکھنے سے طبعاً لے حد دل چسپی

تھی۔ جس کی محرک بیشتر امرائے وقت کی قدردانی اور صلہ و انعام کی تمنّا ہوا کرتی تھی۔ کچھ قطعات تاریخ ایسے بھی ملتے ہیں کہ انھوں نے محض اپنے دوست واحباب یا بزرگوں اور رشتہ داروں کی پیدائش یا وفات پر لکھے ہیں۔ جن سے کسی ستائش کی تمنا یا صلہ کی آرزو کا اظہار نہیں ہوتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں کہ جن میں واضح طور پر قطعات تاریخ پر صلہ نہ ملنے کی شکایت بھی ملتی ہے۔

باب پنجم میں منیرؔ کی مثنوی نگاری پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے اور ان کی دونوں مثنویوں کی خصوصیات اور موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ 'حجاب زناں' میں کس طرح انھوں نے معاشرتی اصلاح کی تدبیریں تجویزیں پیش کیں اور سماجی و اخلاقی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے تربیت اور تہذیبِ نسواں کی ذمہ داریوں کو نمایاں کیا ہے۔ دوسری مثنوی "معراج المضامین" میں کس طرح انھوں نے دوازدہ امام کے اوصاف اور ان کے متعلق بکھری ہوئی روایات و حکایات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مثنوی کے لکھنے کے سلسلے میں انھوں نے اپنے فنِ شعرگوئی کے کمال کو بخوبی ظاہر کیا ہے۔ یہ سب بیان کرتے ہوئے منیرؔ کو مثنوی نگاری میں وہی قدر و منزلت دینے کی کوشش کی گئی ہے جو ان کو قصیدہ گو اور غزل گو کی حیثیت سے ملی ہے۔ ان کی دونوں مثنویاں اپنے موضوعات کے لحاظ سے بے مثل اور لاجواب ہیں، اور قدرتِ فکر، زورِ طبع اور وسیع معلومات کا پتہ دیتی ہیں۔ منیرؔ نے اپنے عہد کی تمام علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی تحریکوں کو اپنے کلام میں محفوظ کردیا اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک مثالی یادگار چھوڑ گئے۔ یہی اثرات مثنویوں میں بھی نمایاں ہیں۔

باب ششم میں منیرؔ کی قصیدہ نگاری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے

# باب اوّل

## سوانح حیات و ماحول

کسی ملک یا قوم کی ترقی اور تہذیب کا اثر اس کے ادب پر بہت گہرا پڑتا ہے اور یہ ادب اس قوم کی ارتقا کے منازل اور تہذیبی مدارج کے مطالعے میں بڑا ممد ثابت ہوتا ہے۔ جب ہم انیسویں صدی عیسوی کے ادبی رجحانات اور معیارِ سخن کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو میر شکوہ آبادی اور ان کا کلام اپنی بلند پایہ قدروں کے لحاظ سے کافی ممتاز نظر آتا ہے۔ انھوں نے ہمارے قدیم ادب میں جو قابلِ فخر روایات پائیں۔ ان سب کو اپنے دامنِ شعر و ادب میں سمیٹ لینے کی کوشش کی۔ اور اپنی غیر معمولی قابلیت اور ذہانت کی بدولت بہت دل کش انداز میں اس عہد کی تمام سیاسی و سماجی تحریکوں اور تبدیلیوں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ اگرچہ انھوں نے ہمارے ادب میں کوئی نئی راہیں نہیں کھولیں لیکن اس انداز سے قدیم خصوصیات کو پیش کیا کہ وہ آنے والی نسلوں کے لئے فکر انگیز اور قابلِ توجہ بن گئیں۔ اور خود ان کے "بازاے یادگار" روزنامہ بن کر اپنے عہد کا قابلِ قدر خزینہ اور ہمارے ادب کا قابلِ فخر سرمایہ ہو گئے۔ انھوں نے اگرچہ مغربی رجحانات اور بدلتے ہوئے معیارِ سخن سے کچھ زیادہ استفادہ

نہیں کیا لیکن اپنی شستہ اور سنجیدہ علمی اور ادبی صلاحیتوں سے کام لے کر قدیم ادبی قدروں کی طرف متوجہ کرنے میں بڑی کامیابی کے ساتھ گراں قدر خدمات انجام دیں۔

اس مقالہ میں ان کی زندگی، شاعری، نثر نگاری اور اس عہد کے تاریخی حالات کی تفصیلات مختلف ابواب میں پیش کی جاتی ہیں۔ تاکہ اس زمانہ کی علمی، ادبی اور تہذیبی روایات کو محفوظ کیا جا سکے اور اُردو ادب میں منیرؔ شکوہ آبادی کا درجہ اور مقام بہ آسانی متعین ہو سکے۔

## پیدائش اور خاندانی حالات

رودادِ منیرؔ اپنی زمانے سے جُدا ہے
دُنیا میں کسی سے مری قسمت نہیں ملتی

قدیم تذکروں اور منیرؔ شکوہ آبادی کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وطن شکوہ آباد ضلع مین پوری تھا اور ان کا نام سید اسمٰعیل حسین تھا چونکہ ان کو لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو مرزا سلامت علی دبیرؔ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ اس لئے انھوں نے اپنے استاد کے تخلص کی صوتی مناسبت سے اپنا تخلص منیرؔ اختیار کیا۔ اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق خود منیرؔ مثنوی "معراج المضامین" میں لکھتے ہیں:-

نویں تاریخ ذی الحجہ کی جو ہے ہمایوں ماہ ہے روز نکو ہے
اسی دن مجھ کو دنیا میں اوتارا عجب روز ہنا میں اوتارا[1]

یعنی وہ ماہ ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو دنیا میں آئے۔ اس مثنوی میں

---

[1] مثنوی معراج المضامین صفحہ ۲، (مطبع گلشن باتری۔ لکھنؤ ۱۳۱۲ھ)

انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش تو بیان کر دی لیکن یہ نہیں لکھا کہ کس سنہ میں ان کی ولادت ہوئی۔ مگر دیوان اوّل کے دیباچہ کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ منیرؔ کی پیدائش سنہ ١٢٢٩ھ میں ہوئی۔ یہ دیوان انھوں نے سنہ ١٢٦٤ھ میں ترتیب دیا اور اس دیوان کے دیباچہ میں مختصراً اپنا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حال آنکہ سمند عمرم تا حال سی و پنج مرحلہ از مراحل زندگی طے کردہ
کہ توفیق اتمام این دیوان دست دادہ"[1]

اس جملہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سنہ ١٢٦٤ھ میں جب یہ دیوان ترتیب دیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر ٣٥ سال تھی۔ مثنوی معراج المضامین کے مندرجہ بالا اشعار اور دیوان اوّل کے مندرجہ بالا دیباچہ کے الفاظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ منیرؔ شکوہ آبادی ٩، ذی الحجہ سنہ ١٢٢٩ھ مطابق ٢٢، نومبر سنہ ١٨١٤ء کو پیدا ہوئے۔ اور اس سلسلے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

"غدر کے چند علما"[2] میں انتظام اللہ شہابی منیرؔ کا سال پیدائش سنہ ١٢٣١ھ لکھتے ہیں۔ جو غالباً کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ دوسرے تذکرہ نویس متذکرہ بالا ماہ و سال کی تائید کرتے ہیں اور ان کا سنہ پیدائش سنہ ١٢٢٩ء ہی لکھتے ہیں۔

جہاں تک ان کے خاندانی حالات کا تعلق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جدِ اعلیٰ کا نام سید بہاء الدین تھا جو سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں اپنا

---

١؎ دیوان اوّل بنام منتخب العالم فارسی دیباچہ صفحہ ٧، ١٣٢٣ھ میں مطبع سعیدی میں طبع ہوا۔
٢؎ غدر کے چند علما از انتظام اللہ شہابی۔

وطن ترک کر کے ہندوستان آئے اور یہیں بس گئے۔ سید بہاء الدین اپنے عہد کے ممتاز بزرگوں میں تھے اور چونکہ علوم ظاہری و باطنی میں یگانہ روزگار تھے۔ اس لئے ہندوستان میں بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آپکے اہل خاندان اپنی علمی فضیلت اور جوہر شرافت کے اعتبار سے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے۔ منشی منیر کے پردادا سید شرف الدین علی خاں کو عہد محمد شاہی میں شکوہ آباد و فیروزآباد کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ اس کے بعد سے انکے خاندان والوں نے شکوہ آباد ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ منیر کے والد احمد حسین متذکرہ بالا شرف الدین علی خاں کے پوتے تھے جو مستقل طور پر شکوہ آباد میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ انتظام اللہ شہابی لکھتے ہیں:۔

"آپ کے جد اعلیٰ حضرت سید بہاء الدین بزمانہ سلطان علاء الدین غوری ہندوستان آئے۔ اور یہیں کے ہو رہے ان کے پوتے کے پڑپوتے سید شرف الدین علی خاں کو عہد محمد شاہ میں شکوہ آباد فیروزآباد کی صوبہ داری عطا ہوئی"[1]۔

منیر کے والد احمد حسین کا تعلق نقوی سادات سے تھا اور اہل ادب کی محفل میں شاعر اور شکر کے تخلص سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے مرزا رفیع سودا کی شاگردی اختیار کی اور ان کے ممتاز شاگردوں میں شمار کئے گئے۔ انھوں نے دو شادیاں کیں۔ ایک بیوی سے مولوی سید ارشاد حسین اور دوسری بیوی سے منیر شکوہ آبادی ہوئے۔ پہلی بیوی قاضی اٹاوہ کی دختر تھیں، اور دوسری آگرہ کی رہنے والی تھیں۔ منیر کے والد کو علمی مشاغل سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ نثر نگاری، اور داستان گوئی میں

---

[1] غدر کے چند علماء۔ انتظام اللہ شہابی صفحہ ۶۶

مشہور تھے۔ انھوں نے عمر طبعی پاکر ۱۲۵۸ھ میں بمقام شکوہ آباد انتقال
(۱۸۴۲ء)
فرمایا۔ ان کے حادثۂ ارتحال پر حسب ذیل قطعہ منیرؔ نے کہا:

میرے والد ماجد ہے ہے جو کامل تھے علم دیں میں
احمد حسین اسم ان کا تھا مشہور افلاک و زمیں میں
شکر اور شاد تخلص دونوں کندہ تھے یہ نقش نگیں میں
سید، پاک، فقیہ، محدث یکتا علم شرع مبیں میں
منشی، شاعر، عابد، زاہد ایسا کون ہے زمیں میں
باغ جہاں ویران ہوا اب گھر پایا ہے خلد بریں میں[۵۸]

منیرؔ کی والدہ کے متعلق کچھ تفصیل دستیاب نہیں ہوسکی۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آگرہ کے کسی معزز گھرانے کی بیٹی تھیں اور ان کا انتقال ۱۲۴۱ھ میں ہوا۔ جیسا کہ منیرؔ کے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔

مادر من آنکہ بود از جناب فاطمہ از ذرۂ دو سیدہ درحسب گشتے تا صرہ
در طریق خدمت بنت نبی رفتے بچشم خاک راہ خضر اش بودے ضیائے باصرہ
نوحہ کردی در عزائے بضعۃ خیر الوریٰ داغہائے ماتمش بودے دید و ساحرہ
رخت در جنت از ین وحشت سرائے عاریت یافت از عفو الٰہی حلہ ہائے فاخرہ
مصرع سال وفاتش نظم کردم اے منیرؔ یاد ماتم دار جوار ئے بتول طاہرہ[۵۹]

منیرؔ کا سنہ پیدائش اور ان قطعات تاریخ کو ذہن میں رکھتے ہوئے جو انھوں نے اپنے والدین کی وفات پر کہے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ منیرؔ کی عمر والدہ کے انتقال کے وقت گیارہ سال اور والد کے انتقال

---

۵۸ منتخب العالم۔ صفحہ ۲۹۹
۵۹ منتخب العالم۔ صفحہ ۲۹۹

کے وقت اکیس سال تھی۔ لیکن اس حقیقت کے برعکس مادھو رام نے اپنے ایک مقالہ میں منیر کے والد کی تاریخ وفات تو ٹھیک لکھی ہے لیکن منیر کی تاریخ پیدائش میں انھیں مغالطہ ہو گیا ہے۔ وہ ۱۹۰۵ء کے اردوئے معلیٰ میں لکھتے ہیں :-

"۱۲۵۰ھ میں منشی منیر کے والد ماجد فوت ہو گئے۔ منیر کی عمر اس زمانہ میں سترہ سال کی تھی۔"[۵]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منشی مادھو رام کی نظر سے مثنوی معراج المضامین اور ان کے دیوان اول کا مقدمہ نہیں گزرا۔ ورنہ وہ اس طرح منیر کا سال پیدائش بجائے ۱۲۲۹ھ کے ۱۲۳۳ھ متعین نہ کرتے۔ منیر کے خاندانی حالات اور اعزا کی تفصیلات کے سلسلے میں مزید معلومات جو فراہم ہو سکیں یہ ہیں کہ دیگر قریبی رشتہ داروں میں منیر کے دو بھائی تھے اور ایک بہن۔ بڑے بھائی سید اولاد حسین اپنے زمانہ کے مجتہد تسلیم کئے جاتے تھے۔ اور مدرسہ ہگلی ضلع کلکتہ میں بمشاہرہ ساٹھ روپیہ ملازم تھے۔ ان کا عقد حکیم ظفر علی خاں رئیس اعظم لکھنؤ کے یہاں ہوا تھا۔ سید اولاد حسین کو بھی اپنے والد محترم کی طرح مذہبیات اور دینیات سے بے حد دلچسپی تھی اور یہ سب علوم انھوں نے اپنے والد ہی سے حاصل کئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے مزید حالات زندگی کا پتہ نہیں چلتا۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۲۵۶ھ میں عین عالم شباب میں ہوا اور منیر کو اس حادثۂ جانکاہ سے سخت صدمہ پہونچا۔ چنانچہ قطعۂ تاریخ وفات میں

---

۵۔ رسالہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ۔ مرتبہ حسرت موہانی بابت فروری ۱۹۰۵ء (مقالہ منشی منیر۔ از مادھو رام)

لکھتے ہیں۔

میرے بھائی متقی و فاضل اولاد حسین — واصل حق ہوگئے وہ صاحب ادراک ہائے
پیشوائے عارفان مقتدائے زاہداں — چھپ گیا وہ نور بارے آج زیر خاک ہائے
قبلہ و کعبہ کے شناگر اور دریائے علوم — سید و میندار آلِ صاحبِ لولاک ہائے
منطق و علم کلام و ہم ریاضی و حدیث — سب میں یکتا اور کامل و دیبا پاک ہائے
عازم جنت جوانی میں ہوئے وہ نور حق — لکھنؤ مجھ کو ہوا آئے وحشت ناک ہائے
جسکے سر سے باغ عالم میں اٹھے ایسا بزرگ — کیوں نہ ڈالے مثل صرصر اپنے سر پہ خاک ہائے
مصرع تاریخ رحلت میں نے پایا اے منیر — آج ڈوبا آفتاب علم و شرع پاک ہائے

منیر کے چھوٹے بھائی کا نام سید حسین اور تخلص مظہر تھا۔ ان کو مذہبیات سے دلچسپی کے علاوہ ادبیات سے بھی دلچسپی تھی اور شعر و سخن کے سلسلے میں اپنے بڑے بھائی منیر سے مشورہ کیا کرتے تھے، بعض تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرثیہ گوئی میں وہ منیر کے شاگرد بھی تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۶۶ھ ۱۸۴۹ء سنہ بیس سال کی عمر میں ہوا۔ منیر کے دیوان میں ان کی تاریخ وفات کا حسب ذیل قطعہ ملتا ہے:

جاتی ہے جان ماتم سید حسین میں — برپا ہمارے گھر میں قیامت ہے دیکھ لو
اس جامع فضائل بے حد کی موت سے — سر پر ہمارے خاک مصیبت ہے دیکھ لو
مشہور تھا مظہر جو بھائی منیر کا — اے غافلو اسی کی یہ تربت ہے دیکھ لو
حاجت نہیں ہے مصرع تاریخ مرگ کی — قبر مظہر بقعۂ جنت ہے دیکھ لو[۹]

۱۲۶۶ھ

منیر کی شادی اور خانگی زندگی کے متعلق اندازہ ہوتا ہے کہ والدین کی زندگی میں وہ مجرد ہی رہے اور اپنے والد کے انتقال کے ایک سال بعد انکی

---

[۸] تنویر الاشعار (دیوان دوم) صفحہ ۲۲۹ — [۹] تنویر الاشعار، صفحہ ۲۳۹

نسبت ایک صاحب علم و فضل خاندان میں ہو گئی۔ خود ایک قطعہ تاریخ میں فرماتے ہیں:

میری شادی منیرؔ آج ہوئی　　برکت ہو خوشی ابد تک ہو
بیّنات و زبر میں ہے تاریخ　　کہ شب عقد یہ مبارک ہو[۱۰]
۱۲۵۱ھ

۱۲۷۷ھ میں منیرؔ جب انڈمان بھیج دئے گئے تو ان کی بیوی اپنے وطن شکوہ آباد میں رہیں اور منیرؔ کی بہن بھی اپنی بھاوج کے ساتھ وہیں رہیں۔ لیکن جلاوطنی کے دو سال کے اندر ہی ۱۲۷۹ھ میں پہلے منیرؔ کی بیوی اور اس کے کچھ دن بعد ان کی بہن کا انتقال ہو گیا۔ منیرؔ کو اس خبر سے سخت صدمہ ہونچا اور قید و بند کے عالم میں اس صدمہ سے متاثر ہو کر انھوں نے حسب ذیل قطعہ لکھا:

بودم از غربت و آلام اسیری بمصائب　　اندران یوم کہ واقع شدہ در خارج دنیا
خبرم آمدہ ز اصحاب وطن مولم و موحش　　کہ دلم سوخت جگر چاک شدہ از صدمہ سراپا
زوجہ ام روز آلام اسیری من انیک　　خانہ ویران شد و برباد شد اسباب در نیا
رحمت حق کندش عفونت برساند　　باز در خلد بریں خادمہ حضرت زہرا
سال مرگش بقلم داد منیرؔ الم آگیں　　مردہ از رنج اسیری من ان زبر علیا[۱۱]

اس قطعہ سے پتہ چلتا ہے کہ منیرؔ کے انڈمان چلے جانے کے بعد انکے خاندان پر کافی پریشانیاں رہیں اور اسی صدمہ میں ان کی بیوی اور انکی بہن کا انتقال ہوا۔ چنانچہ منیرؔ نے جب ۱۲۷۹ھ میں قصیدہ در منقبت حضرت عباس علیہ السلام لکھا تو بڑی بہن اور بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور جب قصیدہ میں اپنے مصائب کا ذکر کیا تو ان دونوں غموں کو بھی بڑے موثر انداز میں

---

۱۰۔ منتخب القصائد۔ صفحہ ۲۹۹

۱۱۔ نظم منیرؔ۔ صفحہ ۵۰۲۔ (پہلا ایڈیشن۔ ۱۲۹۶ھ)

شامل کرلیا۔

وطن سے نکلا مرگ منکوحہ آیا — مرے غم میں اس پر ہوئی موت غالب
اسی غم میں بے جان ہوئی اخت کبریٰ — یہ دو داغ تازہ ہیں اس النوا عجب[11]

اور ایک قطعہ میں بھی اپنے اس غم کے اظہار کا اعادہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

خبر اخت عظمیٰ کے مرنے کی پائی — سوا موت سے کیوں نہ یہ سانحہ ہو
منیر اس کی تاریخ میں نے یہ لکھی — کنیزانِ فضّہ میں وہ صالحہ ہو[12]

منیر کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادے کا پتہ چلتا ہے۔ جن کا نام "سید ابو محمد" اور تخلص بدر تھا۔ وہ رامپور میں ان کے ہمراہ رہتے تھے[13]۔ انھوں نے والد کے تیسرے دیوان پر جو رامپور میں ترتیب دیا گیا۔ حسب ذیل قطعہ تاریخ لکھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو بھی شعر و سخن سے دلچسپی تھی اور شاعری و تاریخ گوئی ان کو ورثہ میں ملی تھی۔

چوں کلام والدم مطبوع شد — گشت جوشاں قلزم معراج نظم
غیبی تاریخ طبعش گفت بدر — طبع زیبا اوج معنی۔ تاج نظم
١٢٩٦ھ
١٨٧٩ء

بدر کے حالاتِ زندگی تفصیل کے ساتھ کہیں دستیاب نہیں ہوتے ہیں۔ "انتخاب یادگار" جو امیر مینائی کی تصنیف ہے اور جس میں رامپور سے وابستہ تمام شعراء کے نام اور مختصر حالات درج ہیں۔ اس میں حضرت بدر کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ صرف "مسدس تہنیت جشن بے نظیر" میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے۔ جس سے ان کے حالاتِ زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے:

"اتفاق سے سید محمد محسن صاحب ہلال تخلص ابن سید ابو محمد بدر

---

[12] نظم منیر صفحہ ٥٧ — [13] نظم منیر صفحہ ٥٩

تخلص سے ملاقات ہوئی انھوں نے بیان کیا کہ جناب بدر کے چار اولادیں تھیں۔ ایک لڑکا، تین لڑکیاں، دو لڑکیاں غیر شادی شدہ انتقال کر گئیں۔ ایک لڑکی کی شادی اعجاز حسین صاحب افغان پوری سابق سب انسپکٹر آبکاری رامپور سے ہوئی۔ سید محمد محسن صاحب کی عمر اب ساٹھ سال کے قریب ہے۔ جناب بدر کے انتقال کے وقت ان کی عمر چھ مہینے کی تھی۔ انھیں کل حالات اپنی والدہ صاحبہ سے معلوم ہوئے۔ جناب بدر رامپور کی عدالتِ دیوانی میں حکم نویس بھی رہے ہیں۔ ان کا انتقال ۴۲ سال کی عمر میں ۱۸۹۱ء / ۱۳۰۹ھ میں رامپور میں ہوا اور تکیہ شاہ رفیق کے قبرستان میں دفن ہوئے۔"[12]

منیر کے بعد ان کے خاندان کے افراد میں شعر و سخن سے دلچسپی اس امر سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے صاحبزادے ابو محمد نے اپنے والد کے تخلص منیر کی رعایت سے اپنا تخلص بدر رکھا اور پھر ان کے صاحبزادہ سید محمد محسن نے ہلال تخلص اختیار کیا۔ گویا منیر کے بعد شعر و سخن کی روایات کو اپنے خاندان میں قائم رکھنے کی انھوں نے کوشش کی۔ لیکن چونکہ کوئی غیر معمولی امتیاز یا انفرادیت حاصل نہ کر سکے۔ اس وجہ سے تاریخ ادب کے اوراق میں ان کو کوئی ممتاز جگہ نہ مل سکی اور رفتہ رفتہ وہ شہرت ختم ہو گئی۔

**تعلیم و تربیت**

منیر کی ابتدائی تعلیم کے متعلق کوئی بات واضح طور پر نہیں ملتی ہے کہ جس سے اندازہ ہو سکے کہ انھوں نے کن

---

۱۲۔ مسدس تہنیت جشن بے نظیر، مصنفہ میر یار علی جان صاحب۔ دیکھئے گو۔ مرتبہ محمد علی خاں اثر رامپوری، طبع اول ۱۹۵۰ء صفحہ ۴۶

اساتذہ سے تعلیم پائی یا اہلِ علم کے کس گروہ سے فیض حاصل کیا بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بچپن میں متداول اور مروجہ طریقوں کے مطابق فارسی اور عربی پڑھی اور دینیات کی تحصیل اپنے بھائی اولاد حسین سے حاصل کی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق انھیں بچپن ہی سے تھا۔ اردو زبان میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کی فطری ذکاوت اور خداداد ذہانت کم سنی کے زمانے ہی میں زبان زدِ خلائق تھی۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فی الحقیقت منیرؔ ان سب علوم و فنون سے پوری طرح باخبر تھے جو اہلِ علم و فضل کے لئے مایۂ ناز کہے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ منیرؔ کو مذہبیات سے غیر معمولی لگاؤ تھا اور وہ اس میدان میں کافی دستگاری رکھتے تھے۔ ان کی مثنوی معراج المضامین ان کے مذہبی عقائد کی پوری طرح آئینہ دار ہے اور ان کی مختلف تحریریں اس کی شاہد ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی غزلوں کے مقطعوں میں شاہ نجف سے عقیدت اور تاجدار مدینہ سے محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں مثلاً:

پہنچے حرم سے تا نجفِ پاک اے منیرؔ — ہر سنگ کعبہ میل رہ مستقیم تھا

نزع میں بھی قبر میں بھی دیکھ لینا اے منیرؔ — مرشد روح الامین مولا علی پیدا ہوا

حیدر کے غلاموں میں منیرؔ اپنی ہو گنتی — جبریل کی تسبیح میں ہے وانہ ہمارا

پہنچائے ہند سے جو مدینہ میں اے منیرؔ — یہ بات ہے عنایتِ خالق سے دور کیا

یا علی حشر میں محروم نہ رہ جائے منیرؔ — لے کے جنت میں اسے اے مرے مولا جانا

منیرؔ کو شروع جوانی ہی میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور وہ اپنا کلام آگرہ اور شکوہ آباد سے بذریعہ ڈاک شیخ ناسخ کے پاس بہ غرض اصلاح بھیجنے لگے۔ آگے چل کر وہ کانپور میں ناسخ کے شاگردوں میں باقاعدہ

شامل ہو گئے پھر ناسخ کی وہاں سے روانگی پر ان ہی کے مشورہ سے انکے شاگرد رشک سے اصلاح لینے لگے اور اس کے بعد مدتوں تک رشک کی صحبت میں رہے اور مختلف مشاعروں میں بھی ان کے ساتھ شرکت کرتے اور ایک عرصہ تک اپنے کلام پر ان سے اصلاح اور مفید مشورے لیتے رہے۔ جیسا کہ انھوں نے خود اپنے دیوان کے فارسی دیباچہ میں لکھا ہے:

"از عنفوانِ جوانی و بدو شباب مجنونِ لیلائے سخن و مفتونِ این شراب کہن بودہ۔ شبہا سرمۂ سوادِ گفتار و روزہا آئینۂ بیاضِ اشعار در نظر داشتم۔ و ہمدراں آوان بعضے نزہات من بوساطت عرق انفعال آب و رنگ اصلاح از افادات افضل البلغا ملاذ الفصحا مجتہد الشعراء عالی جناب شیخ ناسخ تغمدہ اللہ بغفرانہ پذیرفت۔ تا آنکہ بملازمت و علاقہ مصاحبت امیر کبیر نواب نظام الدولہ بہادر خلف اوسط نواب معتمد الدولہ بہادر مرحوم از گوشہ انزوا بر آمدہ سر از گریبان ارتفاع بر آوردم۔ و در کانپور بآستانہ بوس حضرت مجتہد الشعرا مغفور مبرور کہ بتقریبے مہمان مرحوم نواب امین الدولہ بہادر مہر بودند از جواہر الواع استفادہ جیب تمنا مالا مال کردم و بعد معاودت حضرت پیر و مرشد ممدوح الصدر بگلستان ہمیشہ بہار لکھنؤ صانہ اللہ عن کل سوء حسب اشارت فیض بشارت جناب شان دست ارادت بدامان استاد المحققین ملاذ المتبحرین سیدی و مولائی جناب میر علی اوسط رشک زد است انادا تہ زدہ عمرے خوشہ چیں خرمن برکات حضرت ایشان بودہ در لکھنؤ و کانپور مرشد آباد و دیگر بلاد نزدیک و دور مشہور یک

شاعرہا بودم"۔[۱۵]

اس عبارت سے استفادہ کرکے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں :۔

"جس زمانے میں ناسخ کو لکھنؤ سے نکل کر کانپور جانا پڑا۔ منیر اس وقت وہیں نظام الدولہ کی رفاقت میں تھے۔ چنانچہ کانپور میں یہ ان کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے اور انھیں کے مشورہ سے اپنے کلام پر خواجہ آتش میر علی اوسط رشک سے اصلاح لینے لگے"۔[۱۶]

منیر کو اپنے اساتذہ سے خاص عقیدت اور محبت تھی۔ ناسخ اور رشک کی شاعرانہ عظمت کا تذکرہ انھوں نے اپنی غزلوں میں جا بجا کیا ہے مثلاً :۔

| | |
|---|---|
| یکتائے عصر عالم فاضل جناب رشک | علامہ محقق و کامل جناب رشک |
| استاد شاعران جہاں سید جلیل | محتاط و عابد و متوکل جناب رشک |
| اور دو لغات قاعدہ فن شاعری | طے کر چکے تمام منازل جناب رشک |
| دیوان تینوں مصحف اعجاز نظم ہیں | رد کر چکے ہیں جادوئے بابل جناب رشک |
| سوئے بہشت حضرت ناسخ رواں ہوئے | جب ہو چکے اداؤ کے قابل جناب رشک |
| ناسخ تھے آفتاب سپہر کمال کے | برج علوم کے مہ کامل جناب رشک |
| کیونکر نہ میری قدر زیادہ ہو اے منیر | سمجھا گئے تمام مسائل جناب رشک |

منیر کے مزاج میں حقائق کی جستجو اور ہر مسئلے پر غور کرنے کا شوق اور اسباب و علل کو سمجھنے کی صلاحیت غیر معمولی تھی۔ ان کی فطری ذکاوت اور خداداد ذہانت کو دیکھ کر ناسخ جیسے باکمال شخص نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ

---

۱۵۔ دیباچہ منتخب العلوم۔ صفحہ ۳

۱۶۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (طبع اول ۱۹۴۴ء) صفحہ ۶۸

ان کے تمام شاگردوں میں منیرؔ جیسا نمبر سار کھنے والا کوئی دوسرا شاگرد نہیں ہے۔ منیرؔ کے لئے استاد ناسخ کا یہ سمجھ لینا شاعری کی ایک گمراں بہا اور قابل قدر سند سے کم نہیں ہے۔

منیرؔ کو مطالعہ کتب اور تحصیل علم کا جو ذوق بچپن سے تھا وہ آخر عمر تک قائم رہا۔ ان کے قصائد جا بجا اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انھوں نے مطالعہ کتب کے سلسلے میں مختلف اور متعدد نایاب کتابوں کا ذخیرہ بھی فراہم کیا تھا۔ جو ہنگامہ غدر میں برباد ہو گیا۔ چنانچہ منیرؔ کو اپنی تصانیف اور جمع کردہ کتابوں کے تلف ہونے کا سب سے زیادہ غم تھا۔ اسی لئے ایک قصیدہ میں اپنے اس تاسف کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

مال و سرمایہ و اسباب ہوا سب برباد     پر کتابوں کے تلف ہونے سے ہے کرب اجل
میری تصنیف سے تھے جلنے والے نایاب     ان کے گم ہونے سے ہے لذت ہستی میں خلل

ایک اور قصیدے میں جو انھوں نے " در منقبت حضرت امام حسن عباس سید الشہدا " لکھا ہے، اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان کو اپنی بربادی اور تباہی کا کوئی غم نہیں ہے مگر کتابوں کے برباد ہو جانے کا سخت صدمہ ہے۔ (حوالہ)

لٹا مال و اسباب اس کا نہیں غم     کتابوں کے جانے سے ہے رنج غالب

علاوہ ازیں اس عہد کے رواج کے مطابق ان کو فارسی زبان اور فارسی شعر گوئی سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان کو اہل زبان کی طرح پوری قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ فارسی غزلیں اور فارسی خطوط نیز دیوان کا فارسی مقدمہ اس کے شاہد ہیں۔

رشتہ داروں، استادوں کے علاوہ منیرؔ کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ احباب میں روسائے وقت اور بالعموم ایسے لوگ ہوتے تھے جن کو زیارت

کربلا اور محبت پنجتن سے خاص تعلق تھا۔ عالموں، ادیبوں اور شاعروں سے
وہ بہ صد شوق ملتے تھے۔ اور ان کی صحبت میں زندگی کے لمحات گزارنا
سعادتِ دارین سمجھتے تھے۔

شکل و شباہت اور قد و قامت کے متعلق جو کچھ معلومات فراہم ہو سکی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوانی میں وہ کشیدہ قامت تھے۔ اور بدن چھریرا تھا۔ چہرا کتابی اور رنگ گندمی تھا۔ مونچھیں بالعموم کتری ہوئی رکھتے تھے۔ سر پر پٹے رکھتے تھے اور آواز درمیانی تھی۔ بعد جوانی جسم دُہرا ہو جانے پر قد متوسط معلوم ہونے لگا تھا۔ لباس میں گرمیوں کے زمانے میں چوڑی دار پائجامہ ململ کا کرتا اور دُہرے بندوں کا انگرکھا پہنتے تھے اور سردیوں میں روئی دار بنڈی پر شیروانی پہنا کرتے تھے۔ گاہ گاہ ریشمی رومال بھی زیب دوش ہوتا تھا۔ سر پر لکھنؤ کی وضع کی دو پلی ٹوپی اور پاؤں میں سلیم شاہی جوتی ہوتی تھی۔

نیئر کے فطری اور ذاتی رجحانات کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ ایک مصروف زندگی کے عادی تھے۔ اس زمانے کی جو تہذیب اور معاشرت تھی۔ اس کی پوری طرح نمائندگی کرتے تھے اور اپنے زمانے کے تفریحی مشاغل کے سلسلے میں وہ افیون نوشی، پان خوری اور حقہ کشی سے بھی دل چسپی رکھتے تھے جس کا ذکر ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے۔ قیام انڈمان کے دوران جب ان کو ان چیزوں کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے افیون اور حقہ چھوڑنا پڑا اور ان مشاغل سے حسب دل خواہ لطف حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تو اس کا تذکرہ اس طرح اپنے کلام میں کرتے ہیں سہ

ترک افیوں سے اذیت جو ہوئی ہے فزوں اندازۂ تحریر سے

اور حقہ کے لئے لکھتے ہیں:-

ہم ناک میں عزت سے ہو میرا کب تک — حقہ نہ ملے پینے کو اچھا کب تک
تا چند پلیٹوں دمچیاں بیچے پر — بدلا کروں پوست آنکھوں کا کب تک

ایک دوسری رباعی میں پان کے کم یاب ہونے کے سلسلے میں لکھتے ہیں :-

افلاس میں روز پان پاؤں کیونکر — آنکھوں سے نہ خون دل بہاؤں کیونکر
بیڑا ابھی تو نقل کا اٹھاتے ہیں رقیب — میں چھین کر اے منیر کھاؤں کیونکر

افیون، پان، حقہ جو اس زمانے کی معاشرت اور تہذیب و شائستگی کے لوازم تھے۔ منیر کو ان سب سے دلچسپی تھی۔ منیر نہایت خوش خلق، ذہین اور متین انسان تھے۔

**منیر اور شعر و سخن** جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے تقریباً پندرہ سولہ سال کی عمر میں منیر کو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ ان کے گھر میں شعر و شاعری کا چرچا تھا اور آگرہ میں ننھیال ہونے کی وجہ سے منیر وہاں بھی جاتے آتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں آگرہ میں شعر و شاعری کی بڑی گرم بازاری تھی اس لئے منیر کا شوق اور بھی بڑھ گیا۔ آگرہ میں گلزار علی اسیر کا ڈنکا بج رہا تھا۔ حضرت نہر اور باطن کی شاعری عروج پر تھی۔ برابر شاعرے ہوتے رہتے تھے لوگ غزل گوئی اور غزل سرائی کو وقیع نظروں سے دیکھتے تھے۔ منیر نے بھی غزل گوئی میں دلچسپی لی اور دن رات شاعری میں مشغول ہو گئے اور شاعری ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

تقریباً ۱۲۴۴ھ یا ۱۲۴۵ھ میں آگرہ میں ایک مشاعرہ ہوا اور اس میں منیر نے شرکت کی۔ جس کی تفصیل انتظام اللہ شہابی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :-

"حسن اتفاق سے نواب نظام الدولہ خلف الصدق وزیر تنہا اودھ

بطور سیر و تفریح آگرہ آئے ہوئے تھے۔ ان کی دلچسپی اور خوش قسمتی کے لئے مہاراجہ بلونت سنگھ کاشی نے محفل شاعرہ منعقد کی۔ خود بھی شاعر، راجہ تخلص کرتے تھے۔ آسیر و تپہر سے شورۂ سخن کیا تھا۔ اس شاعرہ کی دھوم تھی۔ نامی شعرا شرکت کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔ تیتر کو بھی خیال گزرا کہ غزل کہہ کر شاعرہ میں پڑھی جائے۔ چنانچہ محفل میں پہونچے راجہ کاشی کے چھتے میں یہ شاعرہ تھا۔ راجہ صاحب نے اہتمام خاص کیا تھا۔ استادوں سے پہلے نوآموزوں نے غزلیں پڑھیں۔ ان میں ہی تیتر کو جگہ دی گئی۔ کہتے ہیں ؎

دنیا سے ہے باہر دلِ دیوانہ کسی کا
بستی میں سماتا نہیں ویرانہ کسی کا"[۱]

یہ غزل جس کا مطلع اوپر لکھا گیا ہے دیوان میں شامل ہے اس کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں :-

ساقی نگہ مست تری لڑتی ہے کس سے — کیوں چور نہ ہو نشہ میں پیمانہ کسی کا
کعبہ سے چلے آتے ہیں میخانے کو بادل — پہونچا ہے کہاں نعرۂ مستانہ کسی کا
نیند آئی ہے ہر ایک کو آغوش لحد میں — شاید کہ اجل کہتی ہے افسانہ کسی کا
عاشق ہوں تیتر اپنے ہی انداز سخن کا — وارفتہ کسی کا ہو نہ دیوانہ کسی کا

متذکرۂ بالا غزل کے مقطع کے جو تیور ہیں۔ اس سے ان کی مزاجی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نوآموزی اور نومشقی کے زمانے سے خود اعتمادی اور شاعرانہ فخر موجود ہے۔

---

[۱] غدر کے چند علماء۔ انتظام اللہ شہابی صفحہ ۶۷

آگرہ کے متذکرہ بالا مشاعرے میں منیر کا کلام سن کر نکتہ سنجوں اور اہلِ کمال نے بے حد داد دی اور استادوں نے اپنے پہلو میں بٹھایا۔ اسی مشاعرہ میں نواب نظام الدولہ[۵۸] خلف اوسط معتمد الدولہ وزیر بادشاہ اودھ بھی شریک تھے اور وہ بھی ان کے کلام سے متاثر ہوئے اور جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ منیر کی یہ غزل اچھوتی ہے اور کسی بھی استاذ فن کا قلم اس پر نہیں لگا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور منیر کو اپنے ساتھ لے چلنے کی دعوت دی۔ چنانچہ منیر یہاں سے نواب صاحب کے ساتھ کانپور چلے آئے۔ منیر کانپور میں نواب نظام الدولہ کے ساتھ مقیم تھے کہ اسی اثنا میں (جیسا کہ کئی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے) ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ء میں ناسخ بھی لکھنؤ چھوڑ کر کانپور آئے اور انھوں نے نواب امین الدولہ مہر کے یہاں قیام کیا۔ اسی زمانے میں منیر اور ناسخ کی ملاقات ہوئی اور منیر باقاعدہ ناسخ کے شاگرد بن گئے۔ ناسخ جب لکھنؤ واپس ہوئے تو منیر نے انھیں کے مشورہ سے میر علی اوسط رشک سے اصلاح سخن لینا شروع کی۔ اور کافی مدت تک رشک کے کمالِ فن سے استفادہ کرتے ہوئے انھیں کی ہمراہی میں لکھنؤ کانپور اور دیگر قرب و جوار کے مشاعروں میں شریک ہوئے مگر اس دوران میں مستقل قیام کانپور ہی میں رہا۔ جیسا کہ خود منیر نے اپنے دیوان اول کے نثری دیباچہ میں لکھا ہے۔

منیر کے پہلی بار لکھنؤ آنے کے سلسلے میں کئی مختلف تذکروں کے مطالعہ

---

۵۸۔ نواب نظام الدولہ نواب معتمد الدولہ بہادر مرحوم کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان کے والد رئیس اور وزیر شاہ اودھ تھے۔ اور لکھنؤ میں قیام پذیر تھے مگر نواب نظام الدولہ کا قیام کانپور میں تھا۔ منیر ان کے مصاحب کی حیثیت سے کانپور ہی میں رہتے تھے۔

سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تقریباً ستر سال کی عمر میں پہلی بار لکھنؤ آئے اور اس کی تائید اردوئے معلیٰ اپریل ۱۹۰۵ء میں حسن افضل بدر نے بھی اپنے مقالہ "منشی منیر مرحوم شکوہ آبادی" میں کی ہے[1]۔ مگر منیر نے مستقل قیام لکھنؤ اس عمر میں نہیں اختیار کیا بلکہ قیاس کہتا ہے کہ کسی مشاعرے کی شرکت کی غرض سے رشک کے ہمراہ لکھنؤ آئے ہوں گے۔

ناسخ کے لکھنؤ سے کانپور آنے کا سبب یہ نظر آتا ہے کہ ان کو کچھ سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے ۱۲۴۶ھ میں لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ وہ مجبوریاں کیا تھیں؟ ان کے متعلق صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ نواب معتمد الدولہ وزیر شاہ اودھ ہر طرح سے اپنا رسوخ بڑھانا چاہتے تھے نواب محسن الدولہ کو وزیر شاہ اودھ نے اپنے قبضہ میں کر لیا اور اپنی حیثیت کو مستحکم بنا لیا۔ حکیم مہدی سے مخالفت تھی۔ معتمد الدولہ نے انھیں حریف سمجھ کر نکلوا دیا۔ اس موقع پر ناسخ نے کنایتہً ان کی ہجو اپنی غزل میں کی تھی۔ یہ واقعہ ۱۲۳۵ھ کا ہے مگر جب نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے تو انھوں نے معتمد الدولہ کو معزول کر دیا اور میر فضل علی کو وزیر بنایا ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء میں حکیم مہدی دوبارہ بلائے گئے یہی وقت ناسخ کے زوال کا تھا۔ ناسخ جب دربار میں طلب کئے گئے تو فوراً گھر سے فرار ہو گئے مگر آزاد نے ناسخ کے زوال کی کچھ اور وجہ بتائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"نصیر الدین حیدر کے عہد میں جب ان (ناسخ) کی تعریفوں کی آوازیں بہت بلند ہوئیں تو انھوں نے نواب معتمد الدولہ آغا میر اپنے وزیر سے کہا کہ ناسخ ہمارے دربار میں آئیں اور نصیب [illegible]

---

[1] اردوئے معلیٰ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲۵۔ (مقالہ منشی منیر مرحوم شکوہ آبادی از حسن افضل بدر)

تو ہم انھیں ملک الشعرائی کا خطاب دیں۔ جب یہ پیغام پہنچا تو انھوں نے بگڑ کر جواب دیا کہ سلیمان شکوہ بادشاہ ہو جائیں تو خطاب دیں یا گورنمنٹ انگلشیہ خطاب دے۔ میں ان کا خطاب لے کر کیا کروں گا۔ نواب کے مزاج میں کچھ وحشت بھی تھی۔ حسب الحکم شیخ صاحب کو نکلنا پڑا۔ ۱؎

مگر میرے خیال میں نصیر الدین حیدر کی مدح میں قصیدہ پیش کرنا ناسخ کبھی بھی اپنے مرتبہ سے گرا ہوا خیال نہیں کر سکتے تھے، جبکہ وہ اس سے پہلے معمولی امراء اور وزراء کے دامن دولت سے وابستہ رہنے پر فخر کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں:

"۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر مسند نشین ہوئے۔ سب سے پہلے انھوں نے معتمد الدولہ کو معزول کیا اور میر فضل علی کو اعتماد الدولہ کا خطاب دے کر وزیر بنایا۔ یہ وہی فضل علی ہیں جو بادشاہ بیگم کی سرکار میں داروغہ تھے اور جن کی شکایت ناسخ کی تحریک پر حسن الدولہ کے نواب مرحوم سے کی تھی۔ اب ناسخ کے زوال کا زمانہ آیا۔ شاید مصائب ان کے مقدر میں تھے۔ ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء میں حکیم مہدی بلائے گئے۔ جن کے لکھنؤ سے نکلنے پر ناسخ نے غزل کہی تھی۔ سارے پرانے واقعات تازہ ہو گئے۔ ناسخ طلب کئے گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب چوبدار پہنچا تو انھوں نے دے دھکا اسے رخصت کیا اور گھر سے نکل بھاگے۔ ۲؎"

---

۱؎ آب حیات۔ محمد حسین آزاد صفحہ ۳۵۲۔ (لکھنؤ یونیورسٹی جلد)

۲؎ لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صفحہ ۲۲

ناسخ کے لکھنؤ چھوڑنے پر بھی منیر لکھنؤ آتے جاتے رہے۔ اور شعر و ادب کی محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔

منیر ہر استاد کی عزت کرتے تھے اور ہر ایک کی اصلاح کو اپنی اپنی جگہ پر ماننے کی کوشش کرتے تھے۔ رشک اور ناسخ کے شاگرد ہونے ہوئے بھی مرزا دبیر کی بھی اصلاح کو وہ مفید سمجھتے تھے۔ غزل میں ناسخ اور رشک کی اصلاح کو مانتے مگر مثنوی اور مرثیہ میں مرزا دبیر کی پیروی کرتے تھے۔ اس کے لئے ثابت صاحب لکھتے ہیں:۔

"ایک دفعہ مرزا صاحب مرحوم نے منیر سے کہا کہ "بھئی منیر تمہاری شاعری کو میر اوسط صاحب رشک کی قیدوں نے بہت نقصان پہنچایا۔ بعض وقت اچھے سے اچھا شعر ان قیدوں کی بدولت یا کاٹنا پڑتا ہے یا بھونڈے الفاظ لاکر بگاڑنا پڑتا ہے۔ تم خیر غزل میں ان کی تقلید لازم سمجھتے ہو تو تم کو اختیار ہے مگر مرثیہ مثنوی اور قصیدہ وغیرہ میں خصوصاً جب کوئی واقعہ نظم کرنا ہو تو ان قیدوں اور متروکات کا لحاظ نہ کرو۔ منیر نے عرض کیا حضور ایسا ہی میرا بھی خیال ہے"۔[۲۲]

مختصراً یہ کہ منیر کی شاعرانہ زندگی کا آغاز شکوہ آباد[۲۳] اور آگرہ سے ہوا۔ وہاں سے کانپور آئے۔ کانپور، لکھنؤ، فرخ آباد، باندا وغیرہ مقاموں میں درباروں اور روساء وقت کے یہاں ان کی زندگی وابستہ رہی۔ مرزا غالب کی طرح ان کی زندگی میں آرام کم اور پریشانیاں زیادہ تھیں جیسا وہ خود اپنی غزل کے ایک شعر میں اشارہ کرتے ہیں ؎

---

[۲۲] دربار حسین۔ المعروف بہ چراغ مجالس۔ از افضل حسین ثابت رضوی لکھنوی۔ صفحہ ۱۵

زمانے کی ٹھوکروں نے کھایا ہے ہم کو
ہزاروں کے منہ کے نوالے ہوئے ہیں

جب غدر ہوا تو منیر باندہ میں تھے۔ اس کے بعد منیر کو انڈمان جانا پڑا صرف زندگی کے آخری چند سال انڈمان سے واپسی پر رامپور میں چین سے گزرے اور وہیں خاک کے سپرد ہو گئے۔

## منیر اور ان کے قدرشناس

منیر کے قدر شناسوں میں جن لوگوں کے نام آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ نواب نظام الدولہ۔ کانپور
۲۔ علی اصغر خاں۔ لکھنؤ
۳۔ سید باقر علی خاں۔ لکھنؤ
۴۔ مولانا احمد حسن خاں عرف ج۔ لکھنؤ
۵۔ اسد الدولہ رستم الملک سید محمد ذکی خاں۔ لکھنؤ
۶۔ نواب تجمل حسین خاں فرخ آباد
۷۔ نواب تفضل حسین خاں فرخ آباد
۸۔ ذوالفقار علی خاں باندا
۹۔ نواب علی بہادر خاں باندا
۱۰۔ نواب یوسف علی خاں رامپور
۱۱۔ نواب کلب علی خاں رامپور

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ منیر ۱۲۴۶ھ میں نواب نظام الدولہ خلف اوسط معتمد الدولہ کے ہمراہ کانپور آئے اور تقریباً دس سال یعنی ۱۲۵۶ھ تک ان کا مستقل قیام کانپور میں رہا۔

منیر نے کانپور کے قیام کے دوران میں کئی قطعات تاریخ لکھے ہیں۔ جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ منیر تقریباً ۱۲۵۶ھ تک نواب نظام الدولہ کی مصاحبت میں ان کے دربار میں رہتے رہے اور ناسخ کے علاج و مشورہ سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً دیوان اول کے قطعہ تاریخ نمبر ۴ میں نواب نظام الدولہ کے محل نواب خورد محل صاحبہ سے خلعت پانے کے سلسلے میں انکی مدح میں ایک قطعہ تاریخ فرماتے ہیں:

فزائندہ قدر اہلِ کمال — سخن آفرین و سخن داں پناہ
بہ بحر سعادت گراں مایہ دُر — بہ برج شرف ہمچو خورشید و ماہ
گہر بخش نیا عز اشراف دوست — باقلیم اخلاق صاحب کلاہ
برآورد کام دلِ دو جہاں — شدہ دوست شاداں و دشمن تباہ
رسول خدا یش مددگار باد — مدامش بصد عیش دار و اِلٰہ
چنیں گفت تاریخ خلعت منیر — ہمایوں بود خلعت و درج و جاہ

۱۲۵۵ھ

اسی دوران میں قطعہ تاریخ نمبر ۵، ۶، ۷، اور ۸ میں نواب نظام الدولہ کے محل میں فرزند دوم تولد ہونے کی تاریخ منیر نے نکالی ہے۔ مثلاً:

کر دل پھر فکر تاریخ تولد — تعلّی پر ہے طبع عرش پیما
منیر الہام غیبی ہے یہ مصرع — گلستانِ وزارت کا گل اچھا

۱۲۵۶ھ

حق نے دیا حضور کو فرزند دوسرا — یہ گوہر گرامی دریائے جود ہے
تاریخ یہ منیر نے اس ماہ کی کہی — نور جہاں قدوم ترب وددو ہے

۱۲۵۶ھ

اور ۱۲۵۶ھ میں نواب نظام الدولہ کی بجرے میں سواری کے سلسلے میں فرماتے ہیں :-

نواب نامدار جو بجرے میں ہیں سوار
مدحت سرا زبان ہے ہر شیخ و شاب کی

طالب عرض کر جلوس کی تاریخ اے منیر
ہے آج برج حوت میں جا آفتاب کی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منیر کانپور میں کچھ دن تو آرام و سکون سے رہے مگر پھر ان کو کچھ مالی پریشانیاں ایسی پیش آئیں کہ کانپور چھوڑنا پڑا۔ قیاس کہتا ہے کہ منیر وہاں کچھ اپنے غیر معمولی اخراجات اور رہن سہن کی ضروریات کی بنا پر قرضدار ہوگئے تھے۔ اگرچہ وہاں کی دلچسپیوں اور قدردانیوں کی وجہ سے کانپور چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن مجبوراً بادل نخواستہ ان کو کانپور سے لکھنؤ آنا پڑا جیسا کہ فارسی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"آخر بحوادث گوناگوں مبتلا گردیدہ بہ بیت السلطنت لکھنؤ شتافتم

و بقول فخر المتاخرین مولانا غالب دہلوی ؎

اندران بقعۂ معمورز دبستگی خویش

حسرت آگیں چو گنہگار بزنداں رفتم [۲۳]

لکھنؤ میں بھی کچھ دن پریشان حال رہے اور کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ امیر سخنور علی اصغر خاں کی نگاہ التفات نے ان کی مدد کی اور وہ ان کے دربار سے وابستہ ہو کر کسی قدر اطمینان کی زندگی گزارنے لگے (جیسا کہ ان کے فارسی دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے) ان کے حسب ذیل قطعہ تاریخ کے مقطع سے یقینی طور پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ منیر ۱۲۵۰ھ میں لکھنؤ پہنچتے ہیں۔ اور یہاں ہر طرف محفل نشاط و

---

[۲۳] منتخب العالم دیوان اول صفحہ ۳ دوسری جلد

تعزیہ خانے پاتے ہیں۔ لکھنؤ کے حالات دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے ہیں [redacted]
حشمتِ سلطان سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ لکھنؤ کی زندگی عیش و نشاط
کی محفلوں اور تعزیہ داری وغیرہ کی بہت تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

پیش نظر ہے آج گلستانِ لکھنؤ … ہر ایک سمت نور کا جلوہ ہے دیکھ لو
جلسے سازوں کے ہیں یاروں کی صحبتیں … ہر ایک فن شعر میں یکتا ہے دیکھ لو
پریوں کی دید ہے سر بازار رات دن … ہر کوچہ میں طلسم کا میلا ہے دیکھ لو
کملی سے بھی دو شالوں کو پایا یہاں ذلیل … کشمیر سے یہ شہر زیادہ ہے دیکھ لو
کس طرح حال حشمتِ سلطان بیاں ہو … بس قدرتِ خدا کا تماشہ ہے دیکھ لو
فیاض ہیں تمام امیر اس دیار کے … گھر گھر میں رقص و عیش کا جلسہ ہے دیکھ لو
معراج فاضلوں کو ہے عرشِ کمال پر … ہر ایک اپنے رتبے میں اعلیٰ ہے دیکھ لو
اسلام کا عروج ہے ایمان کا فروغ … صوم و صلوٰۃ کا یہیں چرچا ہے دیکھ لو
درگاہیں اور تعزیہ خانے ہیں نور کے … یہ فیض بزمِ ماتمِ مولا ہے دیکھ لو
اس شہر کو میں کیوں نہ کہوں جنت نعیم … اس کا نظیر ہند میں عنقا ہے دیکھ لو
تاریخ میرے آنے کی ہاتف نے یہ کہی … زندہ منیر خلد میں پہنچا ہے دیکھ لو[۲۴]

سنہ ۱۲۵۷ھ

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ لکھنؤ میں اہل ہنر کے قدردان ظفر الدولہ علی اصغر خاں نے منیر کی غیر معمولی ہمت افزائی کی اور ان کی سرپرستی کی بدولت ان کو فکر معاش سے کسی قدر سکون حاصل ہوا۔ انھوں نے مستقل طور پر (سنہ ۱۲۵۷ھ تا سنہ ۱۲۵۹ھ) لکھنؤ میں قیام کیا۔ اس دوران سنہ ۱۲۵۸ھ میں منیر نے کلکتہ کا سفر کیا اور راستہ میں ایک غزل لکھی جس کا مطلع ہے :-

---

۲۴۔ کلیاتِ منیر صفحہ ۳۱۲ از مطبع نامی گرامی ثمر ہند واقع لکھنؤ

بینا خلافِ وضعِ لسانِ ممات ہے — اے خضر آبرو مجھے آبِ حیات ہے

آخری دو شعروں میں لکھتے ہیں :-

ہے اس غزل کا مصرعۂ تاریخ اے منیر — زیبا عجب کلام ہے کیا خوب بات ہے
کلکتہ کو میں ڈاک میں جاتا ہوں اے منیر — نکہ غزل ہو راہ میں کیا خوب بات ہے

منیر اس سفر میں ڈاک والوں کے ساتھ پالکی میں گئے۔ پالکی کے کہار بہت تیز رفتار تھے۔ راستہ میں کئی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ راستہ میں ہی ان کی بغل میں پھوڑا بھی نکل آیا۔ جس پر عمل جراحی کیا گیا۔ ضمناً اس سفر کا تذکرہ حسب ذیل رباعیات میں ملتا ہے :

کلکتہ کو ڈاک میں چلا ہوں جو میں آہ (۱) غیروں کے پاؤں سے ہوئی قطع یہ راہ
ہیں تیز کہار پالکی میں ہوں سوار — کیا خانہ بدوش میں چلا ہوں واللہ

مضمون اگر راہ میں ہاتھ آتا ہے (۲) خامہ چلنے میں ٹھوکریں کھاتا ہے
حالِ خطِ تقدیر کھلا آج منیر — اپنا لکھا نہیں پڑھا جاتا ہے

پھوڑے نے سفر میں سخت گھبرایا ہے (۳) کلکتہ کی راہ میں یہ دکھ پایا ہے
کیا درد کنار نے ستایا ہے منیر — یہ گرگ بغل راہ میں ہاتھ آیا ہے

جراح کے سامنے جو کھولا پھوڑا (۴) منظورِ نظر میں اس نے تولا پھوڑا
پھوڑے کی جگہ بغل میں دیکھی جو منیر — سب کہنے لگے دل کا پھپھولا پھوڑا

۱۲۵۰ھ کے سفر کلکتہ کی وجوہ اور اسباب کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا ہے۔ ممکن ہے کسی مشاعرہ میں بہ غرض شرکت گئے ہوں یا اپنی خستہ حالی سے مجبور ہو کر کسی قدردانی کی امید میں یہ سفر کیا ہو۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ منیر نے کلکتہ میں زیادہ قیام نہیں کیا۔ کیونکہ انھیں کے کلام میں ایک قطعہ تاریخ اور بھی ملتا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اگلے سال ۱۲۵۹ھ

تک لکھنؤ واپس آ گئے تھے اور پھر اپنے پرانے قدر دانوں سے رشتے استوار کئے تھے۔ چنانچہ نواب معین الدولہ سید باقر علی خاں نے وہ سبب قرض جس کی بدولت منیرؔ ایک عرصہ سے زیر بار تھے ادا کیا اور منیرؔ کو اپنا مصاحب بنا کر ۱۲۵۹ھ میں کانپور بلا لیا۔ جس کا ذکر منیرؔ نے حسب ذیل قطعہ تاریخ میں اس طرح کیا ہے ؎

ظفر جنگ باقر علی خاں امیر ۔۔۔ سپہ آسمان علوم و عطا
جگر بند دستور شاہِ اودھ ۔۔۔ فن شعر و طب میں نہایت رسا
انھوں نے بلایا سوئے کانپور ۔۔۔ کیا قرض ہمت سے میرا ادا
مکرر کیا لکھنؤ سے طلب ۔۔۔ مرا نام اہلِ سخن میں لکھا
کہی میں نے تاریخ اسکی منیرؔ ۔۔۔ ادا قرض نواب نے اب کیا

سنہ ۱۲۵۹ء

منیرؔ کے سید باقر علی خاں کے دربار میں کانپور مصاحب کی حیثیت سے پہونچنے کے کچھ ہی عرصہ بعد مخالفوں اور نکتہ چینوں نے ان کی زندگی دو بھر کر دی۔ اور کچھ ایسی پریشانیوں میں گرفتار ہوئے کہ بقول خود "اگر اس مصیبت کے زمانے میں امیر نیاض مولانا احمد حسن خاں صاحب عروج دستگیری نہ فرماتے تو وہ کب کے راہی عدم ہو گئے ہوتے۔ اسی زمانے میں اسد الدولہ رستم الملک سید محمد ذکی خان بہادر رنیل جنگ عرف نواب بہادر ذکی تخلص نے ان سے اپنے کلام پر اصلاح لینا شروع کر دی اور منیرؔ کو بحیثیت استاد اپنے دربار میں جگہ دی اور ان کی بڑی عزت افزائی کی۔ ایک قصیدہ میں جو انھوں نے بہ عنوان "قطعہ نذر جشن بہ مدح امیر خورشید تنویر نواب معین الدولہ انتظام الملک سید باقر علی خان بہادر ظفر جنگ خلف نواب معتمد الدولہ بہادر مغفور و مبرور کہا ہے۔

فرماتے ہیں ؎

کرسکے تعریف اس سخن کی آبرو اپنی بڑھا    دیکھنا اک آن میں قطرے سے دریا ہوگیا

تقریباً ۱۲۵۷ھ سے ۱۲۶۰ھ تک منیر لکھنؤ میں رہے اور یہاں سے ۱۲۵۸ھ میں کلکتہ گئے اور اسی سال لکھنؤ واپس آگئے۔ ۱۲۵۹ھ میں وہ ایک مرتبہ پھر کچھ عرصہ کے لیے کانپور گئے اور لکھنؤ واپس آگئے تھے۔ منیر لکھنؤ کی صحبتوں کے دلدادہ تھے۔ یہاں کی دلچسپیاں انھیں مجبور کرتی تھیں کہ اپنی مستقل سکونت یہیں اختیار کریں اور شعروشاعری کی محفلوں میں شریک رہیں دوبارہ لکھنؤ آنے پر ان کی کافی عزت و توقیر ہوئی۔ عزت افزائی کے ساتھ ساتھ لکھنؤ سے شہرت بھی دور دور پھیلی اور اسی شہرت کی وجہ سے نواب فرخ آباد نے منیر کو اپنے یہاں بلایا۔ انھیں دنوں ایک مشہور مشاعرہ لکھنؤ میں ہوا جس کا مصرع طرح تھا ؎

"اس کا شیدائی ہوں جس کا کوئی شیدائی نہیں"

حضرت منیر نے اس طرح پر غزل لکھی اور مصرع طرح پر حسب ذیل گرہ لگائی ؎

اور مجھ سا جان دینے کا تمنائی نہیں
اس کا شیدائی ہوں جس کا کوئی شیدائی نہیں

مقطع میں فرمایا:-

لکھنؤ کی آرزو میں جان دیتا ہے منیر
سلطنت کا بھی زمانے میں تمنائی نہیں

مندرجہ بالا مقطع منیر کی اس غیر معمولی محبت کا آئینہ دار ہے جو ان کو لکھنؤ سے تھی۔ اس قسم کے احساسات کے متعدد نمونے ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں۔ کچھ قطعے ملاحظہ ہوں ؎

لکھنؤ کا مجھ کو سودا ہے منیر          دل حسین آباد پر دیوانہ ہے
منیر لکھنؤ میں آئے ہو سمجھ کے پڑھو          محققوں کی ہے اس مجلس سخن میں نشست
منیر لکھنؤ میں چل کے دیکھو قیصر باغ          ہو لئے گلشن جنت اگر دماغ میں ہے

شہر لکھنؤ کے ساتھ ساتھ منیر لکھنؤ کی زبان دانی، سخن سنجی اور بلند معیاری کے قائل تھے۔ بادشاہوں، رئیسوں، شاعروں اور ادیبوں کی دل و جان سے عزت کرتے تھے اور زندگی بھر کبھی لکھنؤ کی صحبتوں کو نہ بھلا سکے۔ لکھنؤ کے مٹ جانے پر بھی اس کی یاد ان کے دل سے نہ مٹ سکی۔ اودھ کی سلطنت بے چراغ ہو گئی لیکن نقش محو نہ ہو سکا۔ اودھ کی تباہی، لکھنؤ کی بربادی، واجد علی شاہ کی نامرادی اور باشندگان مملکت (زن و مرد) کی زبوں حالی کا مرقع کئی شاعروں نے کھینچا ہے۔ مثلاً میر انیس نے "فریاد" اور تلق نے "شہر آشوب" وغیرہ لکھ کر دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ منیر شکوہ آبادی نے حسب ذیل غزل بہ عنوان "داغ غم" لکھ کر اس عقیدت کی طرف اشارہ کیا ہے جو ان کو لکھنؤ سے تھی سہ

دل تو پژمردہ ہیں داغ غم گلستاں ہوں تو کیا
آنکھیں روتی ہیں دہان زخم خنداں ہوں تو کیا

ہو گئے برباد شاہان سلیماں منزلت
اب بلائیں ہوں تو کیا دنیا میں پریاں ہوں تو کیا

موت کے پنجرے میں شیران دلاور پھنس گئے
شیر افگن ایک دو شیر نیستاں ہوں تو کیا

چھٹ گئیں شہزادیاں بن کے گئیں خانہ خراب
اب چڑیلیں صاحب قصر و ایواں ہوں تو کیا

مسجدیں ٹوٹی پڑی ہیں، صومعے ویران ہیں
یاد حق میں ایک دو دل ہائے سوزاں ہوں تو کیا

مٹ گئے قصرِ معلّی، کُھد گئے زرّیں محل
رنج سے معمور گر دل ہائے ویراں ہوں تو کیا
بجھ گئی شمعیں جلیں پروانے تو کیا فائدہ
اُڑ گئے پروانے شمعیں نور افشاں ہوں تو کیا
دیکھنے والے نہیں، پھر آئینے کس کام کے
بے زلیخا شہر سارے یوسفستاں ہوں تو کیا
کربلا میں یا نجف میں چل کے مرجائیں منیر[۱۵]
ہند میں ہم پہلوئے گورِ غریباں ہوں تو کیا

جس زمانے میں منیر لکھنؤ میں محمد ذکی کی مصاحبت میں تھے۔ اسی وقت سے فرخ آباد کے نواب سے سلسلہ خط و کتابت شروع ہوا تھا۔ کیونکہ انھوں نے ایک قطعہ تاریخ بہ عنوان جشنِ نوروز بہ سرکار نواب حشمت جنگ تجمل حسین خاں مرحوم رئیس فرخ آباد" ۱۲۵۹ھ میں لکھ کر بھیجا تھا۔ قطعہ تاریخ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ وہ لکھنؤ سے بھیجا گیا تھا یا کانپور سے، کیونکہ ۱۲۵۹ء میں منیر کانپور بھی کچھ دن کے لئے چلے گئے تھے۔ قطعہ درج ذیل ہے:

| | |
|---|---|
| فرخ اختر دولت خداوندا ابد تک ہو | مرے نواب کے گھر آج ہو نوروز کا جلسہ |
| الٰہی جشنِ کامل رنگ مسعود و مبارک ہو | بطرز بیت اے دل کہی تاریخ یوں میں نے |

۱۲۵۹ھ (کلیات منیر صفحہ ۳۱۴)

نواب فرخ آباد کی قدر دانی اور بلانے پر منیر لکھنؤ چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے اور وہاں تین سال بہت راحت و آرام سے گزارے۔ منیر کو ایک مدت

---

۱۵۔ نظم منیر (دیوان سوم) صفحہ ۱۸۰ } اس غزل میں ۱۴۹ اشعار ہیں۔ جن میں سے چند بطور نمونہ اس جگہ پر درج کئے گئے ہیں

کے بعد ایسا قدردان ملا تھا جو علم و فضل کا بھی مخزن تھا اور مذہبیات سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ گویا میر کی روح تجمل حسین خاں کی ادبی سرپرستیوں کے سایہ میں پہونچکر سرور و انبساط محسوس کر رہی تھی۔ اور ان کو یہ یگانگیت اور ہم مشربی جو ایک عرصہ کے بعد نواب فرخ آباد کی صحبت میں حاصل ہوئی تھی۔ دوسرے مربیوں اور قدردانوں کے مقابلہ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی تھی۔ تجمل حسین خاں کے یہاں دن اور رات ادبی محفلیں رہتی تھیں انھیں کی صحبت میں میر کو ادبی کاوشوں کے بے پناہ مواقع ملے۔ لیکن یہ سکون و اطمینان کی زندگی تین سال سے زیادہ نہ چل سکی اور سنہ ۱۲۶۳ھ میں نواب نے عین عالم شباب میں بہ عمر چوبیس سال انتقال فرمایا۔ اس موت نے میر کے دل پر غیر معمولی اثر کیا۔ جس کا اظہار حسب ذیل قطعہ میں ملتا ہے:-

جہاں تیرہ ہوا مشعل فرخ آباد آج — ہجوم یاس سے ہو خاطر امید خراب
ستم ہوا ہوئے اہل کمال خاک بسر — بہ رنگ برق ہیں اہل سخن کے دل بیتاب
اٹھا زمانہ سے افسوس قدردان ادبا — نظیر جس کا ہے سارے جہاں میں بہت نایاب
سحاب فیض تجمل حسین خاں نایاب — حسین ملک ظفر جنگ تھا اسی کا خطاب
امیر باذل و دریا دل و محیط کمال — طبیب و شاعر و یوسف جمال و فخر جناب
علوم دیں کا حاوی محیط موسیقی — نماز و روزہ کا پابند تھا مرا نواب
ہوئے نہ تھے ابھی چوبیس سال بھی پورے — ہزار حیف یہ موت از ابتدائے شباب
پری کے رخ سے بھی سونا جو بتاتا تھا رنگ — عروس مرگ سے مانوس ہو گیا ہمخواب
ہزار حیف وہ ماہ کمال ظلمت گور — ہزار حیف وہ جسم لطیف و فرش تراب
الٰہی تن پاک بخش دے اس کو — لحد میں کھول دے یارب بہشت کے ابواب

منیر نے کہی تاریخ اس شب غم کی    چھپا زمین میں ہائے آفتاب عالم تاب

۱۲۶۲ھ (کلیات منیر)

تجمل حسین خاں کے انتقال کے بعد تفضل حسین خاں فرخ آباد کے نواب ہوئے مگر ان کے دربار میں منیر کی زیادہ دنوں نہ نبھ سکی اور ان کو طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی عرصہ میں راجہ الور اور راجہ دھولپور نے کئی مرتبہ ان کا سفر خرچ اور بلاوے کے خطوط بھیجے مگر منیر نے مناسب نہیں سمجھا کہ زندگی کے بقیہ دن اجنبی شہروں میں گزاریں۔ اس کے علاوہ ان کے شاگرد رشید لالہ مادھو رام جو کہ صاحب دیوان شاعر تھے اور فرخ آباد ہی میں مقیم تھے کہیں اور جانے سے ان کو روکتے تھے۔ اور خود منیر کو بھی ان سے یک گونہ لگاؤ تھا۔ اسی وجہ سے وہ دھولپور اور الور کے راجگان کی دعوت پر ان کے درباروں سے منسلک نہیں ہوئے۔ بلکہ سلسلۂ واقعات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ منیر نواب تجمل حسین کے انتقال کے بعد ۱۲۶۴ھ میں باندہ گئے اور وہیں دیوان اول مکمل کیا۔ مگر زیادہ عرصہ نہ رکے بلکہ اسی سال واپس آگئے۔ اور ۱۲۶۵ھ تک فرخ آباد ہی میں رہے لیکن حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے باندہ کے نواب ذوالفقار علی خاں اور ان کے فرزند علی بہادر خاں سے راہ و رسم قائم رکھی۔ جن کے حوالے اور تذکرہ حسب ذیل متعدد عرضیوں میں ملتے ہیں۔ جو انھوں نے فرخ آباد سے باندہ روانہ کی تھی۔ ایک عرضی میں لکھتے ہیں ؎

جب سے رخصت ہوا میں حضرت سے    جان جاتی ہے زور فرقت سے
یہی حسرت ہے کس طرح پہنچوں    بوسۂ آستان والا لوں
بس کہ عارض کے حال میں ہوں اسیر    ہوئی عرضی کے لکھنے میں تاخیر

آئے گا جب جواب عرضی کا    حال اپنا حقیر لکھے گا

دوسری عرضی میں جو ۲۶ ربیع الاول ۱۲۶۴ھ کو نواب علی بہادر کو لکھی گئی ہے، حقیر پھر فرماتے ہیں:

عرض ہے یہ ایک خوشہ چیں کی    عرض ہے یہ ایک کمترین کی
خدمت سے حضور کی جو ہے دور    دل ہے بے صبر آنکھیں بے نور
مرتا ہے غم مفارقت سے    جیتا ہے امید ملازمت سے
قسمت ہوتی اگر مددگار    کس واسطے چھوٹتا وہ دربار
پر شکر جناب حق تعالیٰ    جینے کا یہ سبب نکالا
حضرت کا آج شقہ آیا    بے جان تھا میں مجھے جلایا
دو شقوں میں نظم و نثر رنگیں    گویا ہیں نجوم و عقد پرویں
قسمت سے ملا امیر ایسا    کیوں کر نہ کروں میں شکر حق کا
ہے سب سے سوا یہ فخر بے شک    بھولے نہیں آپ مجھ کو اب تک
معلوم ہوا پڑھی جو تحریر    کچھ راہ پر آئی میری تقدیر
اخلاص جو دور سے ہے مجھ کو    امید حضور سے ہے مجھ کو
دیکھوں میں صبح و شام شقہ    بھیجیں حضرت مدام شقہ
اے دل یہی رات دن دعا کر    اے لب تو حضور کی ثنا کر
اے سر اسی در سے آنکھوں کو مل    اے پاؤں تو باندہ کی طرف چل
ہر وقت حضور میں رہوں میں    سایہ کی طرح جدا نہ ہوں میں

تیسری عرضی میں جو ۲۵ شعبان ۱۲۶۴ھ کو نواب ذوالفقار علی خاں والی باندہ کو بجواب شقہ لکھی گئی ہے۔ حقیر نے پھر فرمایا ہے:

سجدہ عجز کر کے زیب جبیں    عرض کرتا ہے خادم دیریں

جب سے سرکار نے کیا رخصت — شرر افشاں ہے آتشِ حسرت
شوق ایسا ملازمت کا ہے — داغِ دل دیدۂ تمنا ہے
ہوں حضوری کے شوق سے دل ریش — میری آنکھیں ہیں کاسۂ درویش
کیوں نہ کھل جائیں دل حباب آسا — ایسے دریا سے میں پھروں پیاسا
در مقصد ہزاروں لے جائیں — پر مجھے چند قطرہ ہاتھ آئیں
اندر نوکر ہیں سیکڑوں کامل — فیض پاتے ہیں عالم و جاہل
ایک ان میں سے ہے جو یہ خادم — کچھ قباحت نہ آئے گی لازم
شفقتِ خاص نے کیا جو ورود — راہ پر آئے طالعِ مسعود
تھی جو تاریخوں کی بہت تعجیل — نظم کیں میں نے حسبِ امرِ جلیل

ایک چوتھی عرضی میں جو ۲۲ صفر سنہ ۱۲۶۸ھ کو نواب علی بہادر کو لکھی گئی فرماتے ہیں:-

لاکھوں تسلیم لاکھوں آداب — ہوں شوقِ ملازمت سے بیتاب
اس غم میں ہوں زندگی سے بیزار — دیکھوں میں کس طرح وہ دربار
بھولے تو نہیں حضور مجھ کو — دل سے سمجھیں ہیں دور مجھ کو
لیکن مطلب میرا یہی ہے — شقوں کے آنے کی خوشی ہو
شقہ سرکار کا جو آیا — گویا کہ کیا ہما نے سایا
کیا نظم ہے کیا زبانِ فارس — بوئے گل بوستانِ فارس
دیوان جو آیا ریختے کا — دل کو راحت ملی سراپا
واسوخت ہو حضرت قلق کا — انشاء بہار ہوش افزا
چادر شالی ہے سبز زریں — کشمیر کا کام عشرت آگیں
کمخواب کا تھان بھی ہو بھاری — زربفت کی جس میں آبداری

پر ملن دو شالہ لاجوردی — سوسن دیکھے تو چھائے زردی
ہے سی عدد شقّت سیم مسکوک — لایا قبضہ میں عبد مملوک
تاکید حضور نے جو کی ہے — عرضی میں غزل لپیٹ دی ہے
عاصی نے یہ قصد کیا تھا — اس بحر میں نظم ہو سراپا
پر حکم حضور کا یہی تھا — یعنی کہ ہو وصف زلف و رخ کا
رقعہ مجھ کو شتاب لکھئے — عرضی کا بھی جواب لکھئے

بہرکیف خود منیر کے کلام سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ منیر نواب تجمل حسین خاں کے انتقال کے بعد باندہ کے نواب ذوالفقار علی خاں کے یہاں گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر پینتیس سال کی تھی اور منیر نے وہیں دیوان اوّل ترتیب دیا اور نواب علی بہادر نے اس کا تاریخی نام رکھا۔ لیکن اس وقت کچھ قابل اطمینان قدردانی نہ ہونے کی وجہ سے شاکی معلوم ہوتے ہیں اور وہاں سے فرخ آباد پھر واپس آجاتے ہیں۔ واپسی پر خارش کے مرض میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے عرضی لکھنے میں تاخیر ہو جاتی ہے مگر منیر نے نواب علی بہادر کو ۳ ربیع الاوّل سنہ ۱۲۶۴ھ کو ایک عرضی لکھی۔ اس میں باندہ سے رخصت ہونے پر اظہار افسوس کرتے ہیں اور وہاں کی یاد میں بےچین نظر آتے ہیں۔ ان سے پھر ملاقات کی تمنا کرتے ہیں اور ان کے لطف و کرم کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ تقریباً تین ہفتے بعد پھر دوسری عرضی ۲۶ ربیع الاوّل سنہ ۱۲۶۴ھ کو نواب علی بہادر کو بھیجتے ہیں جس میں دو رقعے جو اصلاح سخن کے لئے منیر کے پاس آئے ہیں، ان کا جواب دیتے ہوئے صاف صاف دربار کی خدمت کی تمنا کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی سن ہجری میں نواب ذوالفقار علی خاں والی باندہ منیر کو رقعہ روانہ کرتے ہیں۔ منیر اس کے جواب میں ۲۷ شعبان سنہ ۱۲۶۴ھ

کو ایک عرضی بھیجتے ہیں۔ جس میں پھر اپنی ملازمت کا اشتیاق ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح سے باندہ سے برابر شفقے نظم و نثر کے بغرض اصلاح کے آتے رہتے ہیں اور منیرؔ برابر فرخ آباد سے باندہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ۱۲۶۵ھ میں نواب علی بہادر ایک غزل کی فرمائش کرتے ہیں اور کئی تحائف مثلاً کمخواب کا تھان، دو شالہ لاجوردی، ۳۶ سکہ سیم، ولایتی کاغذ اور لفافے وغیرہ وغیرہ منیرؔ کو بھیجتے ہیں۔ منیرؔ اس کا جواب ۲۲ صفر ۱۲۶۵ھ کو دیتے ہیں اور جواب میں ان کے خط کے منتظر رہتے ہیں۔

علی بہادر خاں کے والد بزرگوار نواب ذوالفقار علی خاں کا انتقال ۱۲۶۵ھ میں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد جب ۱۲۶۵ھ میں نواب علی بہادر

---

؎ نواب علی بہادر خاں :۔ نواب علی بہادر خاں جو نواب ذوالفقار علی خاں کے فرزند تھے باندہ کے نوابوں میں تیسرے نمبر پر آتے ہیں۔ ان کے چچا نواب شمشیر علی خاں بہادر کی کوششوں سے باندہ کی ریاست کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ان کے بعد ان کے بھائی نواب ذوالفقار علی خاں والیٔ ریاست ہوئے۔ ان کا انتقال ۸ رمضان ۱۲۶۵ھ مطابق اگست ۱۸۴۹ء میں ہوا منیرؔ نے ان کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ لکھا جس کا مقطع ہے ؎

"موزوں نمود سال مسیحی چنیں منیرؔ     شد آہ ذوالفقار علی در نیام آہ" ۱۸۴۹ء

نواب ذوالفقار علی خاں کے انتقال کے بعد علی بہادر خاں ان کے جانشین ہوئے وہ نہایت سخاوت اور جری تھے۔ باندہ میں علی بہادر کا دورِ حکومت بہت کچھ امن و چین کا حامل تھا۔ رعایا بہت خوش تھی اور نہایت آرام و آسائش کے ساتھ زندگی گذار رہی تھی۔ منیرؔ شکوہ آبادی اس سلسلے میں قصیدہ کے ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

نواب کے کرم سے زمانہ ہے کامیاب     باندہ میں روز دیکھیے چرچا ہے عید کا

یہی وہ نوجوان ہے وہ جس کے لیے غالبؔ نے تمنا کا اظہار کیا ہو ؎ (باقی صفحہ ۵۳ پر)

اپنے والد کے جانشین ہوئے تو منیر نے کئی تاریخی قطعات ان کی مسند نشینی پر لکھے۔ ایک قطعہ تاریخ میں فرماتے ہیں ؎

علی بہادر عالم پناہ بندہ نواز ——— نہاد چوں بسر خویش افسر شوکت
منیر مصرع تاریخ ایں تجمل گفت ——— جلوس باد مبارک بہ مسند نصرت[۲۶]

نواب ذوالفقار علی خاں کے انتقال کے بعد بھی منیر نے نواب علی بہادر سے راہ و رسم جاری رکھی اور برابر موقع آنے پر قطعہ تاریخ لکھ کر بھیجتے رہے جیسا کہ حسب ذیل قطعے سے ظاہر ہوتا ہے حکومت برطانیہ سے نواب کو خلعت ملنے پر منیر اس طرح خوشی کا اظہار کرتے ہیں)

باقی فٹ نوٹ۔ صفحہ ۵۲

---

غالب خدا کرے کہ سوار سمند ناز ——— دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

نواب علی بہادر کو فکر سخن سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

قصد کرتا ہوں ترے گھر سے جو میں جانے کا ——— دل یہ کہتا ہے تو چل میں تو نہیں آنے کا
ترے خدنگ ادا کا رہی نشانہ ہوا ——— کہ جس کے عشق سے تو آفت زمانہ ہوا
یہ سمجھ نہ سوجھی کہ مجھ پر گزر گئی کیا کیا ——— تمھیں تو یہ حسرت مرا فسانہ ہوا
یہ کیا کیا جو کیا دعوئے وفا تو اب ——— کہ اس کو اور جفا کے لئے بہانہ ہوا

پہلی جنگ آزادی کے ہنگاموں میں نواب نے غیر ملکی حکومت کی سخت مخالفت کی جب انگریز دوبارہ برسر اقتدار ہوئے تو انھوں نے ان کو اندور میں نظر بند کر دیا اور ۳۶۰۰۰ روپیے سالانہ بطور گزارہ مقرر کئے اور وہیں ان کا انتقال ۱۲۹۰ھ میں ہوا عقیدت و مخلصانہ محبت جو منیر کو اپنے سرپرست قدیم علی بہادر سے تھی۔ وہ برابر قائم رہی۔ چنانچہ ان کے انتقال کی خبر سن کر رنجیدہ ہوئے۔ اپنے دلی جذبات کا اظہار حسب ذیل قطعہ تاریخ میں اس طرح کرتے ہیں ؎

نواب علی بہادر اے بحر کرم ——— یوسف طلعت شجاع یکتا ہے ہے
اے قدر شناس و ناز بردار منیر ——— اے اہل سخن کے عزت افزا ہے ہے
اے صدر نشین حلق و اقبال و شکوہ ——— اے بزم کرم معنی مسند آرا ہے ہے
اٹھ جائے جواں تو زمانے سے ہائے ——— صد حیف افسوس و دریغا ہے ہے

۲۶۔ تنویر الانظار، صفحہ ۳۲۵ } تاریخ رحلت کہے کے کہتا ہے منیر
نیا مزار ہمارا زیبا ہے ہے

خلعت آیا گورنری سے بنا — کھل گیا باغ ثروت اور جلال
میرے نواب ہو گئے مسرور — ہو مبارک یہ سال فرخ فال
کہی برجستہ میں نے یہ تاریخ — آج آیا ہے خلعتِ اقبال[۲۸]

سنہ ۱۲۶۶ھ میں نواب علی بہادر نے منیرؔ کو ایک طلائی چھلّا بھیجا جس کے متعلق منیرؔ حسبِ ذیل قطعۂ تاریخ میں فرماتے ہیں:-

نواب نے باندہ سے جو بھیجی ہو نشانی — چھلّا نہیں گرداب یمِ فیض عیاں ہے
چھلّا ہو کہ یہ حلقۂ گیسوئے پری ہے — چھلّا ہے کہ گویا دہنِ تنگ بتاں ہے
گستاخی ظاہر ہو جو اس چھلّے سے گل کھائیں — اس بات کی مشتاق ہر اک رخ رخیاں ہے
چھلّا یہ بنا ہے زرِ خورشید سے شاید — سونے کی چمک برق صفت جلوہ کناں ہے
اس چھلّے کی تاریخ منیرؔ اب یہ رقم کر — انگشترِ زیبائے سلیمانِ جہاں ہے

سنہ ۱۲۶۶ھ

چنانچہ نواب ذوالفقار علی خاں کے انتقال کے بعد علی بہادر کے مسند نشین ہونے پر بھی منیرؔ سنہ ۱۲۶۶ھ تک فرخ آباد میں رہے۔ آخر سنہ ۱۲۶۶ھ میں باندہ چلے گئے اور نواب علی بہادر رئیس باندہ کے یہاں ان کے کلام پر اصلاح دینے کے لئے دو سو روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ نواب موصوف منیرؔ کی بہت عزت کرتے تھے اور اپنے مصاحبین میں ان کو شمار کرتے تھے۔ منیرؔ ان کی خوشنودیِ مزاج کا بے حد خیال رکھتے تھے اور جب کبھی کوئی موقع ملتا تھا ان کو خوش کرتے تھے۔ دیوانِ دوم میں ایک قطعۂ تاریخ ملتا ہے جس سے نواب علی بہادر کی قدر افزائی اور منیرؔ کی برجستہ گوئی مسلّم ہو جاتی ہے۔ اس قطعہ کے متعلق انتظام اللہ شہابی لکھتے ہیں:-

---

۲۸ تنویر الاشعار (دیوان دوم) صفحہ ۲۳۵ (جلد ثانی مطبوعہ سعیدی پریس ۱۳۲۶ھ۔ رامپور۔

"نواب علی بہادر ایک دن اپنے باغ میں حسب معمول ٹہلنے جانے لگے۔ منشی منیر کو بھی ہمراہ لیتے گئے۔ دوران چہل قدمی میں پائیں روش سے ایک پھول توڑ کر ان کو دیا۔ اس پر فی البدیہہ تاریخ کہہ ڈالی اور نواب کے سامنے پیش کی"[۲۹]

وہ قطعہ حسب ذیل ہے۔

صبح آئے حضور میرے پاس | نور حق کا ہوا افلاک سے نزول
لے گئے اپنے ساتھ بگھی پر | ہو گیا مطلب عظیم حصول
پھر ہوا کھانے میں ہوئے مصروف | جس طرح تھا ہمیشہ کا معمول
پھر دکھائی گلاب باغ کی سیر | گل جنت سے بھی سوا ہر پھول
گل تازہ دیا منیر مجھے | ہو گئی باغ باغ جان ملول
میں نے برجستہ یہ کہی تاریخ | گل خورشید ہو اجی ہی پھول[۳۰]

سنہ ۱۲۶۷ھ

اس قطعہ کو سن کر نواب علی بہادر بہت خوش ہوئے اور منیر کی عزت و توقیر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ منیر کی زندگی نہایت آرام سے گزرنے لگی۔ واقعات کی تفصیلات جو مہیا ہو سکی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ منیر شکوہ آبادی سنہ ۱۲۶۹ھ تک باندہ میں نہایت آرام و آسائش سے رہے اور وہیں سنہ ۱۲۶۹ھ میں انھوں نے اپنا دوسرا دیوان بنام "تنویر الاشعار" مکمل کیا۔ لیکن زمانے کے انقلابات نے جو ہر طرف ہندوستان میں رونما ہو رہے تھے زیادہ دن تک وہاں پر ان کو چین سے رہنے نہ دیا۔ باندہ کا

۲۹۔ غدر کے چند علماء۔ انتظام اللہ شہابی۔ صفحہ ۲۰
۳۰۔ تنویر الاشعار۔ صفحہ ۱۴۱

زندگی میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا اور ان کا عیش و آرام پریشانیوں اور مصیبتوں میں تبدیل ہو گیا۔

## ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی اور منیر

۱۸۵۷ء میں جس طرح ہندوستانیوں نے برطانوی اقتدار کے خلاف جنگ کرنا شروع کی اور آزادی حاصل کرنے کے لئے جو قربانیاں دیں۔ ان کا سلسلہ تقریباً پچھلے سو سال سے چل رہا تھا جو مختلف واقعات اسی دوران میں پیش آئے اور جن حالات نے ہندوستانیوں کو انگریزوں سے بدظن کیا۔ ان کی تفصیلات کی یہاں پر ضرورت نہیں ہے مختصراً صورت حال یہ ہوئی کہ ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ اختر کو لکھنؤ کے تخت و تاج سے محروم کیا گیا۔ بقول ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل:-

"واجد علی شاہ نے دل برداشتہ ہو کر اور کچھ نشاطی ماحول سے متاثر ہو کر کہ جس کی ذمہ داری بھی زیادہ تر غیر ملکی افراد پر تھی اپنی بے بسی بھلانے اور غم غلط کرنے کے خیال سے فوجی تنظیم کا خیال ترک کر کے دیگر مشاغل تفریح کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انگریز افسر اور ارباب حل و عقد کو بہترین موقع ہاتھ آیا۔ چنانچہ فروری ۱۸۵۶ء میں بد انتظامی اور بدامنی کا الزام لگا کر انکو نظر بند کر دیا اور اودھ کے پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔"[۳۱]

۱۸۵۷ء میں جو ہنگامے میرٹھ، دہلی اور الٰہ آباد وغیرہ میں رونما ہوئے۔ ان کو کچھ غیر ملکی اور کچھ ہندوستانی پنجابی فوجوں کی مدد سے دبانے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں تقریباً دو سال سارے ہندوستان کا سیاسی

۳۱۔ اردو غزل کے پچاس سال حالی تا اکبر۔ از ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل صفحہ ۹۴ طبع اول ۱۹۶۱ء

وسماجی نظام درہم برہم ہوگیا اور دہلی میں بھی نوابی حکومت کا اقتدار ختم ہوگیا جیسا کہ " اردو غزل کے پچاس سال" میں لکھا ہے۔

" آخر کار ستمبر میں بہادر شاہ ظفر ہمایوں کے مقبرہ سے گرفتار کر کے جلاوطن کر دیئے گئے اور یہ کہتے ہوئے ہندوستان سے رخصت ہو گئے ؎

علاؤ یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے
بطور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے" [۳۲]

لکھنؤ اور دلی میں انگریزی افسروں نے وہ ظلم کئے جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی ہے۔ یگ جتنا بھی غم مناتے وہ کم تھا بربادی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ہاشمی لکھتے ہیں:

" ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ کی جو تباہی ہوئی اس کی دو حیثیتیں ہیں ایک ۱۸۵۶ء میں اخراج سلطنت اودھ کے باعث واجد علی شاہ کا لکھنؤ چھوڑ کر کلکتہ چلے جانا۔ دوسرے خود ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے مصائب واجد علی شاہ کی حکومت اور ان کا انتظام سلطنت انگریزوں کی نظر میں چاہے جتنا ناقص رہا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اودھ کا بچہ بچہ ان سے محبت کرتا تھا۔ ان کا پیار بھی رعایا سے بے حد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ درد دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہوئے لکھنؤ سے رخصت ہو گئے تو لکھنؤ میں ایک کہرام مچ گیا۔ یہ جنگ اصل میں دو تمدنوں کا ٹکراؤ تھا۔ صدیوں پرانا مشرقی تمدن پامال ہو رہا تھا۔ اسی

---

۳۲۔ اردو غزل کے پچاس سال حالی تا اکبر از ڈاکٹر خلیل۔ صفحہ ۸۸

لئے لوگ جتنا بھی روتے کم تھا"[۲۳]

لکھنؤ میں عیش و عشرت کا دور ختم ہو چکا تھا۔ معاشی تباہ حالی، مفلسی اور بے روزگاری تو عام تھی۔ مسلمان پریشان حال تھے۔ شعراء اور ادیب اودھ سے روانہ ہو کر دوسری طرف جا رہے تھے۔ ہر طرف سماجی و اقتصادی حالت تباہ تھی بقول ممتاز آہ:-

"ہر طرف حال یہ تھا کہ شہزادیاں اور وزیر زادیاں ننگے پاؤں بین چیتھڑے لپیٹے در بدر اور صحرا بہ صحرا ماری ماری پھرتی تھیں روٹی کے ایک ایک ٹکڑے اور پانی کے ایک ایک پیالے پر اپنا ہزاروں کا مرصع زیور آتار کر دے دیتی تھیں"[۲۴]

سارا ہندوستان ان ہنگاموں سے زیر و زبر ہو رہا تھا۔ ہر طرف پریشانیاں اور آشفتہ حالیاں رونما تھیں۔ روہیل کھنڈ اور بندیل کھنڈ میں جو ہنگامے ہو رہے تھے یعنی جو واقعات پیش آ رہے تھے۔ ان کے اثرات باندہ اور فرخ آباد کے علاقوں اور وہاں کے برسر اقتدار حاکموں اور نوابوں پر بھی پڑے چنانچہ نواب باندہ کے پاس جھانسی اور تانتیا ٹوپی کے پیام جنگ آزادی میں شرکت کرنے کے لئے آئے۔ چونکہ نواب باندہ آزادی کے سرپرستوں میں سے تھے۔ انھوں نے اپنے وزیر مرزا ولایت حسین اور اپنے مصاحب منیر شکوہ آبادی سے صلاح و مشورہ کیا۔ دونوں نے جان بازی اور سرفروشی کا وعدہ کیا۔ بہر کیف نواب باندہ نے فرخ آباد کو درست کر کے راج گڈھ کے تھانہ پر حملہ کیا۔ اور قلعہ جیت لیا۔ دو آہ بدلیہ گرفتار ہوا۔ اور منیر نے

---

۲۳۔ لکھنؤ اور جنگ آزادی ادبی اکیڈمی لکھنؤ۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صفحہ ۱۱۱ (بار اول ۱۹۵۷ء)

۲۴۔ امیر مینائی مصنفہ ممتاز علی آہ۔ صفحہ ۶۸

اس فتح کی خوشی میں حسب ذیل دو قطعات لکھے ہے

چو فوج بندیلہ بباندا رسید    زحصن اجے گڈھ برائے فساد
برایشاں ظفر یافت نواب ما    دل اہل انصاف گردید شاد
چنیں گفت تاریخ نصرت منیر    خدا فتح عالی بہ نواب داد [۳۵]

۱۲۶۴ھ

فتح دی اپنی عنایت سے خدا نے آپ کو    سب عدو مقتول تیغ و بستۂ زنجیر ہیں
آیۂ انا فتحنا مژدۂ فتح قریب    تہنیت سے ہم زباں ورد لب تقریر ہیں
کیوں نہ ہو فضل خدا چشم عنایات رسول    آپ ہمنام جناب شاہ خیبر گیر ہیں
فتح زیبا ہو مبارک ہو مٹا خار خلش    آپ منظور نگاہ مالک تقدیر ہیں
لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار    صورت نصر من اللہ جوہر شمشیر ہیں [۳۶]

اسی زمانے میں مسٹر ایچ۔ اے کاک ڈل نامی ایک انگریز کا قتل آزادی کے دیوانوں نے باندہ میں کر دیا۔ جس سے متاثر ہو کر وائٹ لاک نے باندہ پر حملہ کیا۔ مگر اس کو کامیابی نہ مل سکی۔ انگریز برابر اپنی کوششوں میں لگے رہے اور انھوں نے دوبارہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے اپریل ۱۸۵۸ء میں باندہ پر حملہ کر دیا۔ اس دفعہ باندہ کے نواب کو شکست ہوئی اور باندہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ باندہ میں انگریزوں کا اقتدار قائم ہونے پر نواب باندہ نے جب مصلحت وقت کے لحاظ سے فرار ہونا مناسب سمجھا اور راستہ میں گرفتار کر لئے گئے تو ان کے ساتھیوں پر زمین تنگ ہو گئی اور کوئی سہارا نہ رہا۔ منشی ولایت حسین وزیر باندہ اور منشی منیر دونوں نے فرخ آباد کا رخ کیا۔ چونکہ منیر باندہ آنے سے قبل فرخ آباد

---

۳۵۔ دیوان سوم بنام نظم منیر۔ صفحہ ۱۴۵    ۳۶ نظم منیر۔ صفحہ ۱۲۰

کے نواب کے پاس رہ چکے تھے اور وہاں کے نواب اور روساء میں انکی کافی رسائی تھی۔ لیکن انگریزوں نے ان لوگوں کا بری طرح پیچھا کیا اور راستہ میں ہر دو گرفتار ہو گئے۔ منیر کے خلاف غالباً بغاوت کا کچھ زیادہ ثبوت نہ مل سکا اور اس وجہ سے کچھ دن تعزیری کارروائیوں اور قید و بند کی مصیبتوں سے محفوظ رہے مگر منشی ولایت حسین کو جو وزیر باندہ تھے مجرم قرار دے کر بطور سزا انڈمان بھیج دیا گیا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

باندہ کی ریاست کو محکوم بنانے اور سب اہم شخصیتوں کو گرفتار کرنے اور سزا دینے کے بعد انگریزی افواج نے فرخ آباد کا رخ کیا۔ نواب تفضل حسین کے ساتھ ان کے بھائی سخاوت حسین خاں بہادر بھی باغی قرار دئیے گئے۔ ان کو پھانسی کا حکم ہوا۔ اس کے علاوہ دو رئیسان فرخ آباد نواب اقبالمند خاں

---

۲؎ نواب تفضل حسین خاں :- نواب تجمل حسین خاں کے انتقال کے بعد نواب تفضل حسین خاں ۱۲۶۳ھ میں فرخ آباد کے نواب ہوئے۔ ان کے ارد گرد علماء و شعرا کا مجمع لگا رہتا تھا۔ منیر بھی باندہ آنے سے قبل کچھ دن ان کے دربار میں رہے تھے اور رجب ۱۲۶۴ھ میں ان کی شادی ہوئی تو منیر نے حسب ذیل قطعہ تاریخ لکھا ؎

وصالِ عروس اس کو حاصل ہوا — گل آسا کھلا سرورِ عدل و داد

کمالِ مراد و سرور آ ملا — کھلا لوحِ دل کو دعا کا سواد

عروس اور دولھا کو مسرور رکھ — الٰہی مکمل ہو طرح وداد

الم اور دکھ درد کو دور کر — عدو کو دکھا راہ صلح و سداد

کہا دل کو ملک دہر نے مصراع سال — سرور دل دہر عمدہ مراد ۱۲۶۴ھ

غدر کی ناکامی کے بعد نواب مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ زندگی کے بقیہ دن وہیں گزارے انکی تعلیم و تربیت نوابزادوں کی طرح ہوئی تھی۔ مگر آخر وقت میں ان کو بہت تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اور نواب غضنفر حسین خاں ہنگامے کے لپیٹ میں آ گئے اور قتل کئے گئے۔ منیر نے اس حادثۂ جانکاہ پر حسب ذیل قطعات تاریخ لکھے :-

قطعہ تاریخ نواب سخاوت حسین خاں :-

ریاض علق سخاوت حسین خاں نواب ۔۔۔ نہال باغِ کرم زیب مسندِ شوکت
جوان قابل و فرزند خاص نصرت جنگ ۔۔۔ غلام آلِ نبی سرور بہ قمر طلدت
سخاوت اور مروّت میں بے نظیر جہاں ۔۔۔ ریاست اور امارت کے واسطے زینت
ہر ایک دل میں جگہ اسکی جان سے بڑھ کر ۔۔۔ ہر اک زبان پر اس کا وظیفۂ مدحت
زمانہ اس کی مروّت پہ اس طرح شیدا ۔۔۔ شامِ روح ہو جس طرح عاشقِ نکہت
وہ بے گناہ ہوا تیغ مرگ سے مقتول ۔۔۔ عنایت اس کو کیا حق نے گلشنِ جنّت [۳۲]
منیر نے یہ کہی اس کے قتل کی تاریخ ۔۔۔ ہوا شہید امیر اسیر با ہمت

۱۲۷۴ھ

قطعہ تاریخ نواب اقبال مندخاں بہادر و نواب غضنفر خاں بہادر رئیسانِ فرخ آباد :-

اقبال مند خاں و غضنفر حسین خاں ۔۔۔ دونوں در محیط عطا آہ آہ ہائے
دونوں جوان نیک امیرانِ ذی حشم ۔۔۔ مقتول تیغ تیز قضا آہ آہ ہائے
تاریخ ان کے قتل کی کافی ہے یہ منیر ۔۔۔ دونوں شہید راہ خدا آہ آہ ہائے [۳۳]

۱۲۷۴ھ

نواب تفضل حسین خاں کو باغی تو قرار دیا گیا مگر پھانسی کی سزا سے محفوظ رہے۔ اپنے بھائی اور معززین شہر کی بے عزتی نے انکے دل کو سخت صدمہ پہونچایا! وہ زندہ تو رہے مگر ان کا زندہ رہنا مردوں سے بدتر تھا۔

منیر ان ریاستوں یعنی باندہ و فرخ آباد سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے

---

۳۲ و ۳۳۔ نظم منیر صفحہ ۲۹۱

جنگ آزادی میں حصہ لیتے ہوئے انگریزوں کی مخالفت کی تھی اور جب از سر نو اقتدار حاصل کرنے پر انگریزوں نے والیانِ ریاست اور معززین کو سزا دینا شروع کی تو وقتی طور پر کسی سخت سزا سے منیر شکوہ آبادی بچے ہوئے تھے اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے منیر کی طرف سے انگریزوں کا دل صاف نہیں تھا اور ان کے ساتھی ملنشی ولایت حسین کو پہلے ہی انڈمان بھیجا جا چکا تھا اور منیر کے لئے بھی اس قسم کی سزا احکام وقت کے ذہنوں میں گھوم رہی تھی اسی دوران میں ایک تازہ واقعہ پیش آیا کہ باندہ میں "نواب جان" طوائف کا قتل ہو گیا اور اس میں ان کو شامل سمجھا گیا۔

## منیر اور جزائر انڈمان

"نواب جان" کے قتل کے سلسلے میں قدیم تذکروں اور خود منیر کی تصانیف سے بہ غور مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ بعد غدر ایک طوائف مسماۃ نواب جان کے قتل کا حادثہ سنہ ۱۲۶۷ھ میں بمقام فرخ آباد واقع ہوا جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہیں کے ایک باشندے مصطفےٰ بیگ کو اس کا ملزم قرار دیا گیا مگر انھوں نے کسی نہ کسی صورت سے اس الزام میں منیر شکوہ آبادی کو بھی شامل کر کے اور اپنے سر سے وہ الزام ٹال کر انھیں کے سر تھوپ دیا۔ صحیح طور پر یہ پتہ نہیں چلتا کہ قتل کیوں ہوا مگر خیال یہ ہے کہ اس زمانے کی پر عیش و نشاط زندگی اور خوشحالی و فارغ البالی کی سرگرمیوں میں اس قسم کے واقعات رونما ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یعنی طوائف سے تعلق رکھنا، ان کا گانا بجانا سننا سوسائٹی میں معیوب نہیں تھا۔ اکثر خاندانی اور ڈیرے دار طوائفیں درباروں سے وابستہ ہوتی تھیں۔ ممکن ہے کہ نواب جان کا تعلق فرخ آباد کے دربار سے رہا ہو اور اس طرح سے منیر کی بھی جان پہچان ہو جیسا کہ

بشن نرائن حامی لکھتے ہیں :-

"صحیح سبب تو بیان کرنا مشکل ہے مگر اتنا ضرور ہے جیسا کہ واقف کاروں سے اتنا ضرور سنا ہے کہ مقتولہ نواب صاحب کی محبوبہ بھی تھی" [۳۲]

بشن نرائن حامی کی عبارت قابل توجہ ہے کیونکہ ان کے والد دیبی پرشاد عرف دیبی سہائے صاحب صادق، منیر کے شاگرد تھے۔ جن کا ذکر منیر نے اپنی غزل کے ایک مقطع میں اس طرح کیا ہے ؎

ان تنگ قافیوں میں نہ کہتا غزل منیر
مجبور ہے کہ خاطر دیبی سہائے ہے

چنانچہ اس قسم کی معلومات حامی صاحب کو قابل اعتبار اور واقف کار لوگوں سے دستیاب ہوئی ہوں گی جو اس عہد کی زندگی پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ علاوہ ازیں دیوانِ سوم میں ایک خط منیر کا ملتا ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ منیر کو روساء عصر کے اس قسم کے معاملات سے دلچسپی تھی۔ منیر نے ایک خط حکیم محمد حسن خاں صاحب طبیب اعلیٰ سرکار مہاراجہ گوالیار کو ان کے والد کی تعزیت کے سلسلے میں لکھا تھا۔ اظہار افسوس کے بعد ایک مخصوص مسئلے کی طرف متوجہ کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک نامعقول عورت اور اس کی لڑکی اپنی بدکرداریوں کی وجہ سے سرکار کی نوکری سے معزول کر دی گئی ہے اور اس کو اس شہر (رامپور) میں رہنے کی ممانعت کر دی گئی ہے اور وہ مرادآباد منتقل ہو گئی ہے۔ اب سننے میں آیا ہے کہ دورانِ عدت میں کچھ لوگ آپ کے ذریعہ سے ان دونوں بدکرداروں کا

---

[۳۲] آجکل دہلی ۱۵ ستمبر ۱۹۴۹ء مضمون بعنوان منیر شکوہ آبادی از بشن نرائن حامی صفحہ ۶

تعلق مہاراجہ (گوالیار) سے کرانا چاہتے ہیں۔ یہ صورت حال آپ کی دور اندیشی اور مآل بینی سے بہت دور معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کا امکان ہے کہ ان میں سے کسی نے فرخ آباد وطن ہونے کے رشتہ سے یا اپنی دل ربائی کی وجہ سے ایسی صورت پیدا کرلی ہو۔ لیکن اس قسم کی تحریک دونوں ریاستوں (رامپور و گوالیار) میں خوش گوار تعلقات کے لئے مضرت رساں ہو سکتی ہے اگر اس کی ذمہ داری آپ پر ہے تو اس کا تدارک جلد از جلد ضروری ہے اور اگر کسی دوسرے کی یہ حرکت ہے تو بھی اپنی امکانی کوشش اس کے لئے کریں۔ خدا کی قسم کہ دیرینہ اخلاص نے مجھے اس دردسری پر مجبور کیا ہو ورنہ مجھے اس خرافات سے کیا تعلق ع ہر کسے ناصح برائے دیگراں ۔ ۔ ۔ ۔

میتر کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

"بر ضمیر درست مخفی نماناد کہ فلانہ دخترش بعلت روا ہوست اوضاع و انہماک بافعال نکوہیدہ و دتمرن و احیاء معاشرت الواط و اوباش و مددوادن اختلاط بفہاء بدقماش از نوکری این سرکار دولت مدار معزول و از اقامت و بود و باش درین بلاۃ الخیر ممنوع و معزول گردیدہ براہ آباد رخت اوباد کشیدہ حالیا چناں سماع و شیاع رسیدہ والعہدۃ علی من یتفوہ بہ کہ بعض متوسلان آں دوست دولت عدت و ستم مخدومی حاصتہ تحریک علاقہ آں فاجرہ بین عالی جاہ تین در سلسلہ متعلقین ازیال ملازمان مہاراج صاحب بہادر میفرمایند ہر چند این تحنی از دور اندیشی و مآل بینی مخدوم مستبعد و بدیع مینماید اما تخیل کہ احدہما توطن سواد فرخ آباد دراہ تشفیع آوردہ و اخری بیاض رخسار و قامت فتنہ بار و رادہ حیلہ

نظر زہی با قرار دادہ باشد کیف ما کان بشرط صدق این روایت از نکات امور کدائیہ از خیر طلبان جانبین منہل عذب دوستی دو بیتین آلمخ تر دماء معین مشرب اتحاد ریاسیتن راحقد ملیا زدہ گفتہ اند اندک اندک خیلی وقطرہ قطرہ نیلی۔ اگر این روایت حاشا کم اللہ مجملا راہ بدہ داشتہ باشد پس تلافی مافات باید بر خاک واین رخنہ را کہ ہنوز از چشمہ سوزن بیش نیست بحسن تدبیر آنچنان بست کہ آب رفتہ بجوے در آید واگر بنظر مثل السائر بیت میشود الاصل کہ دامن حضرت ازین لوث پاک است دیگران ازین آتش خاموش دود بر آوردہ اند بقدر امکان وحتی وسع چشم ازالہ آن نباید بست حقا کہ اخلاص دیرینہ من بر این کاوکاو آوردہ والا من کیستم کہ بوکالت فضولی ایقاظ نائمین وانتباہ غافلین مہ اوام۔ واللہ در من نابل مکاہر کسے ناصح برائے دیگراں۔ الخ۔....."

(نظم منیر صفحہ ۶۳۴)

مندرجہ بالا خط سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ منیر کو رؤساء وقت کی ذاتی اور خانگی زندگی سے دلچسپی اور تعلق رہا ہے اور جس طرح سے وہ رامپور وگوالیار کے نوابوں کی زندگی کے اندرونی حالات سے دلچسپی رکھتے تھے اور ان کو بہتر بنانے کی تدبیریں کیا کرتے تھے ممکن ہے کہ ان کو اسی طرح کا تعلق فرخ آباد کے نواب کی زندگی اور نواب جان کے قتل سے رہا ہو۔ اس خط کے علاوہ ایک اور بھی واقعہ منیر کی زندگی کا خود ان کے کلام کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے۔ جو اس امر کا شاہد ہے کہ منیر کو اس قسم کی زندگی سے دلچسپی ضرور تھی۔ دیوان اول میں تین تاریخی قطعات ملتے ہیں۔ جو انھوں نے بڑی

محنت سے اپنی محبوبہ کی وفات پر کہے ہیں جن کا نام "زہرہ" تھا۔ ان کی محبوبہ کا انتقال ۱۲۶۴ھ میں جبکہ منیر فرخ آباد میں تھے اٹھارہ سال کی عمر میں ہوا۔ جو حسین ماہر موسیقی اور شعر و سخن کی قدر داں تھیں۔ منیر کو ان سے دلی لگاؤ تھا۔ حالانکہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے ان کی عظمت پر کسی طرح کا دھبّہ آئے۔ کیونکہ اس زمانے کا ماحول ہی ایسا تھا اور منیر کی زندگی رؤساء و امراء کے درباروں سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس قسم کی سوسائٹی میں شامل ہونا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

منیر کے قطعات تاریخ حسب ذیل ہیں:۔

زہرہ کی مرگ نے مجھ کو مار گئی | زیست میں جان کی کہ تلخی ہے
اسکی زلفوں کے غم میں تمام شباب | سجد اتنے کی اندھیری ہے
زندگی میں مزا نہیں ہے منیر | زہر سائل تلخ شہد ہستی ہے
خواب ہی میں مجھے دکھا یارب | بس یہی شکل زندگی کی ہے
بخش دینا اسے بحق بتول | بندہ پرور جناب تیری ہے
چھلے کے گل ہوں یا کہ داغ جگر | جو نشانی ہو اس پری کی ہے
ہے یہ تاریخ ان نشانیوں کی | چھلے کے گل ہیں داغ دل بھی ہے

۱۲۶۴ھ

0/66 1211 17:9

ممکن ہے طوائف نواب جان سے بھی منیر کا کچھ تعلق رہا ہو۔ اور اس بنا پر یہ قتل کے الزام میں شامل کر لئے گئے ہوں اور مصطفٰے بیگ نے سرکار برطانیہ کو ان کی طرف سے بدظن دیکھ کر اس موقع سے فائدہ اٹھایا ہو اور اپنا الزام ان کے سر تھوپ دیا ہو۔ کیونکہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۸ء میں بہ غرض فخر ... فرخ آباد ولایت حسین وزیر باندہ کے ساتھ جانے

کے سلسلے میں یا اسی مقدمہ منیر پر قائم ہوا۔ وہ برابر چلتا رہا اور ۱۲۷۶ھ میں ایک دوسرا مقدمہ (اسی قتل کے سلسلے) میں ان کے خلاف قائم ہو گیا۔ جس میں وہ نواب جان کے قتل میں شامل شمار کیے گئے اور ان کو سزائے حبس دوام ہوئی۔ منیر نے خود بھی اس واقعہ کی طرف اپنے قطعات میں اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ ان کے دیوان سوم میں ایک قطعہ بعنوان "مصائب قید" ملتا ہے جس کے ضمن میں مندرجہ بالا الزام کے حوالے ملتے ہیں۔ جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

فرخ آباد و دیار ان شفیق    چھٹ گئے سب گردش تقدیر سے
آئے باندے میں مقید ہو کے ہم    سو طرح کی ذلت و تحقیر سے
اک مرا شاگرد تھا اس شہر میں    پھل وہ پائے گلشن توقیر سے
لفظ خاں کا جز اول کر وزیر    نام اس کا جان اس تقریر سے
کیں سعادت مندیاں اس نے بہت    رہ گیا عاجز مری تقدیر سے
جس قدر احباب خالص تھے وہاں    در گزر کرتے نہ تھے تدبیر سے
پر ہوں کیا نادش اہل نفاق    تھے وہ خونریزی میں بڑھ کر تیر سے
نشتر کا خنجر زبانیں ان کی تھیں    قتل کرتے تھے مجھے تزویر سے
مصطفےٰ بیگ ایک صاحب ان میں ہیں    کج روی میں بڑھ گئے چرخ پیر سے
کر کے خون ناحق نواب جان    مجھ کو بھی پھنسوا دیا تزویر سے
خون بیرادہ سمجھتے تھے حلال    تھا جو میں ودیعت قبیر سے [۵۵]

جب یہ قتل کا واقعہ ہوا تو منیر فرخ آباد میں تھے۔ قتل کی ایک مدت تک تفتیش جاری رہی ہوگی۔ مصطفےٰ صاحب نے اپنے بیان میں منیر کی

۵۵۔ دیوان سوم بنام نظم منیر۔ صفحہ ۹۶

شرکت کا اظہار کیا ہوگا۔ اور ایسی نشان دہی کی ہوگی کہ پولیس کو ان کی شرکت کا یقین ہوگیا ہوگا۔ کیونکہ حکومت کی نظر میں میر پہلے سے ہی باغی ثابت ہوچکے تھے۔ ممکن ہے کہ مصطفیٰ بیگ اس وقت کے سیاسی حالات کے لحاظ سے کچھ گورنمنٹ کی نظر میں عزیز ہوں۔ اس لئے وہ تو بچ گئے اور میر کو قتل میں شامل سمجھا گیا۔ مگر گوپی چند نارنگ نے اپنے ایک مضمون "۱۸۵۷ء اور اردو شعرا" میں لکھا ہے:-

"یہ بھی ممکن ہے کہ میر اس قتل میں فی الواقع شریک ہوں اور اپنی بدنامی کا داغ دھونے کے لئے شیعت کی آڑ لی ہو۔"[۱۱]

کیونکہ میر کے مندرجہ بالا قطع کے ایک حسب ذیل شعر میں اس کا حوالہ ملتا ہے:-

"خون میرا وہ سمجھتے تھے حلال تھا جو میں دریت شبیر سے"

میر قتل کے واقعہ میں شریک رہے ہوں یا نہ ہوں اتنا تو صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مقتولہ سے میر کو ہمدردی تھی کیونکہ میر اس حادثہ کا تذکرہ اپنے قطعہ میں "کرکے خون ناحق نواب جان" کے الفاظ میں کرتے ہیں اور مصطفیٰ بیگ کے اس فعل کو "تزویر" سے تعبیر کرتے ہیں۔ باندہ سے وارنٹ گرفتاری جاری کردیا گیا۔ دوستان فرخ آباد نے بہت کوشش کی کہ ضمانت پر رہا کرالیں مگر کوشش بیکار ثابت ہوئی۔ میر کو جب خبر لگی کہ ان کو ایک اخلاقی مجرم قرار دے کر گرفتار کیا جانے والا ہے اور ان کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہوگیا ہے اور اس کا اشتہار بھی دے دیا گیا ہے تو انھوں نے

---

[۱۱] - نگار نمبر دسمبر ۱۹۵۹ء نیاز فتحپوری۔ مقالہ ۱۸۵۷ء اور اردو شعراء بسلسلہ ماہ نومبر از گوپی چند نارنگ صفحہ ۱۴

روپوش ہونے کی کوشش کی۔ جس کا ذکر خود انھوں نے اپنے ایک قصیدہ میں
اس طرح کیا ہے ؎

اس زمانے میں کہا ہے یہ قصیدہ میں نے  کہ مصائب میں گرفتار ہیں اعلیٰ اسفل
روز ہوتا ہوں ہر شخص کے گھر میں روپوش  آج پھانسی کی خبر ہے تو اسیری کی ہے کل
تنگ ہے ستر بدن فرش ہے اک کہنہ حصیر  جان و عزت کے تردد کے مصیبت پہ بل

اسی روپوشی کے سلسلے میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ "دربار حسین" میں
ثابت صاحب بیان کرتے ہیں:۔

"ایک بزرگ فرخ آباد کے رہنے والے بیان فرماتے تھے کہ ایک رات کو ایک تنومند فقیر آیا جو ایک تہمد (بند) لگائے میلا کچیلا کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے نہ دست سوال دراز کیا نہ منھ سے کچھ بولا تصویر کی طرح خاموش دیر تک گردن جھکائے کھڑا رہا۔ زبان حال سے گویا میر کا یہ شعر پڑھتا تھا ؎

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

والد مرحوم نے پوچھا کہ بھئی تم کیا چاہتے ہو؟ جب بھی اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ والد مرحوم نے نوکروں کو کسی بہانے سے وہاں سے باہر بھیج دیا اور اس فقیر سے کہا۔ میر صاحب ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ مگر افسوس میں آپ کو چھپا نہیں سکتا۔ اگر نقصان پہنچے اور آپ بچ جائیں جب بھی مضائقہ نہیں مگر افسوس کہ آپ کا اشتہار گرفتاری جاری ہے۔ آپ ضرور گرفتار ہو جائیں گے۔ یہ کہہ کر ان کی خفیہ مدد کی۔ نہ معلوم کتنی اشرفیاں دیں۔ وہ صاحب چلے گئے۔ دو

چار دن کے بعد والد مرحوم نے فرمایا کہ بیٹا تم نے ان فقیر کو نہیں پہچانا وہ سید تنیر تھے"[۴۲]

غرض تنیر بچ نہ سکے اور جلد ہی پکڑے گئے۔ باندہ کی جیل میں ایک سال سے زیادہ رہے۔ جہاں انھوں نے طرح طرح کی مصیبتیں اٹھائیں۔ گرمی سردی دونوں موسموں کی پریشانیاں اس قید خانہ میں اُٹھانا پڑیں۔ اسکے بعد الہ آباد منتقل کر دئیے گئے۔ پھر الہ آباد سے کلکتہ کے لئے پابہ زنجیر پیدل روانہ کئے گئے۔ کلکتہ میں تصویریں کھنچی گئیں اور کالے پانی بھیجے گئے۔ تنیر نے ان تمام مصائب کا تذکرہ حسب ذیل اشعار میں کیا ہے ؎

کچھ شدائد قید کے کہہ دوں اگر — خون ٹپکے ہر لب تقریر سے
باندہ کے زندان میں لاکھوں ستم — سہنے پڑتے ہم گردش تقدیر سے
کوٹھری تاریک پائی مثل قبر — تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
بول و غایط کی جگہ بستر کے پاس — تھی نجس تر خانۂ خنزیر سے
پانی تھا نایاب مثل آبرو — چاہتے تھے خنجر و شمشیر سے
کیا تیمم یا وضو ممکن نہ تھا — کیسے طاہر رہتے کس تدبیر سے
ترک انیوں سے اذیت جو ہوئی — ہے فزوں اندازۂ تحریر سے
سختیٔ نزع یہودی و مجوس — سہل تھی اس سختیٔ تقدیر سے
روٹیاں گوبر کی گویا ملتی تھیں — نان گندم تھی سوا اکسیر سے
گھاس ترکاری کے بدلے تھی نصیب — خشک تر تھی سبزۂ شمشیر سے
بھلنس کی سانی سے بدتر دال تھی — سخت دانہ دانۂ زنجیر سے

---

[۴۲] دربار حسین از افضل حسین ثابت۔ مضمون بہ عنوان "تنیر بہ حیثیت مرثیہ گو" (اس کتاب میں لکھنؤ کے مرثیہ گو شعراء کا ذکر ہے)

تھا بچھونا ٹاٹ، کمبل اوڑھنا — گرم تر پشمینۂ کشمیر سے
کوٹھری گرمی میں دوزخ سے فزوں — دست و پا بد تر تھے آتش گیر سے
کانپتے تھے موسمِ سرما میں یوں — جیسے عریاں سردیٔ کشمیر سے
محنت و مزدوری و تکلیف و رنج — تھا زیادہ حیطۂ تحریر سے
قاتلِ اشراف و اہلِ علم تھے — رنج پہونچاتے تھے ہر تدبیر سے
بے مروّت، بے حیا، اہلِ دغا — کج طبیعت ہر جوان و پیر سے
ان کے ہونٹوں نے تعلّش کے واسطے — باتیں سیکھی تھیں زبانِ تیر سے
جل میں ٹھگ بدیاں میں بے بدل — نقدِ جاں تک چھین لیں تزویر سے
کاہ سے اٹھوائیں وہ کوہِ گراں — ورنہ گذریں کودکِ بے شیر سے
پھر الہ آباد میں بھجوا دیا — ظلم سے تلبیس سے تزویر سے
ننگی تلواریں کھنچی تھیں گرد و پیش — نوکیں سنگینوں کی بد تر تیر سے
جو الہ آباد میں گزرے ستم — ہیں فزوں تقریر سے تحریر سے
پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں — گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں — ناتواں تر قیس کی تصویر سے
راستے میں ظلم اعدا بے شمار — ہر گھڑی تھے تامتِ تقدیر سے
بے حواس و بے لباس و بے دیار — دل گرفتہ جو کہ چرخِ پیر سے
سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے — تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے
نقشہ کلکتہ میں کھنچوایا مرا — رنگ منھ کا اڑ گیا تصویر سے
سال کے پانی میں جو پہونچے یک بیک — کٹ گئی قیدِ ستم تقدیر سے
یہ کہی تاریخ ہم نے اے منیر — صاف نکلے خانۂ زنجیر سے[۴۳]

---

۴۳؎ نظم منیر صفحہ ۴۹۶

جب منیر انڈمان پہونچے تو ان کے پاؤں کی بیڑیاں کاٹ دی گئیں اور جسمانی تکالیف اور قید ستم کے مصائب سے کسی قدر سکون ملا۔ ذہنی طور پر بھی منیر کو وہاں پہونچکر کسی قدر اطمینان ہو گیا۔

زمانہ کا انقلاب دیکھئے کہ ایک غریب، عالم، شاعر، مجاہد گوشہ نشین حاسدوں کی بدولت کیسا تباہ ہوا۔ آٹھ سال کی سزا ہوئی۔ اس میں سے ایک سال سے زیادہ ہندوستان کے قید خانہ باندہ میں گزرے اور پھر سات سال کے لئے ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں انڈمان روانہ کئے گئے۔ منیر کو خود اپنی سزائے انڈمان کے متعلق انگریزوں کے انصاف اور زیادتی میں شبہ تھا۔ چونکہ درحقیقت وہ جرائم پیشہ نہ تھے۔ لہذا ایسی سخت سزا انھیں فطرتاً ناگوار گزری ہوگی۔ لیکن اس ناراضگی کا اظہار جس سنجیدہ پیرائے میں انھوں نے کیا ہے آجکل کے بڑے بڑے مدبر اور مدعیان تہذیب بھی نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جس استقلال سے منیر نے کام لیا ہے اسکی تردید ناممکن ہے۔ ایک قصیدہ جو انھوں نے قید فرنگ کے عالم میں لکھا ہے اور جس کا عنوان "فریاد زندانی" ہے۔ اس کے ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

جو ٹھہرے مدعی، قاضی وہی مفتی وہی ٹھہرے
اگر ہو غیر ثالث تو عدالت کی ہو آسانی
(کلام منیر صفحہ ۴۹۵)

حکومت پر اعتراض ہے کہ سرکار مدعی بھی ہوتی ہے اور خود ہی فیصلہ کرتی ہے۔ منیر کی رائے میں ایسے مقدمات کے فیصلے کے لئے کوئی آزاد خیال اور ناطرفدار جج مقرر ہونا چاہیئے تھا۔

۱۲۷۷ھ میں جب منیر انڈمان پہونچ گئے تو حسب ذیل رباعی میں

فرماتے ہیں ؎

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا — زہر غربت شکر فروشوں کو ملا
جب لخت جگر کھانے لگی پیاس منیرؔ — کالا پانی سفید پوشوں کو ملا

بعد غدر منیرؔ کو جسمانی اور دماغی دونوں طرح کی پریشانیاں لاحق تھیں جیسا کہ انھوں نے خود ایک قطعہ تاریخ ۱۲۷۵ھ میں فرمایا ہے:

میں کیا کہوں کہ رنج و بلا میں ہوں مبتلا
فکر سخن دماغ سے کوسوں بعید ہے (نظم منیرؔ، صفحہ ۲۹۵)

جزیرۂ انڈمان پہونچ کر ذہنی اور جسمانی پریشانیوں سے منیرؔ کو مقابلتاً سکون ملا اور وہ جزیرہ انڈمان کے بندرگاہ پورٹ بلیر میں تبدیلوں کے محرر مقرر ہو گئے پہلے ان کو چھ روپے ماہوار مشاہرہ ملا۔ پھر اس میں اضافہ ہو کر آٹھ روپیہ ملنے لگا۔ اور آخر میں ان کو دس روپیہ ماہوار تک ملنے لگے تھے۔ اس قلیل رقم میں جو منیرؔ کو محرر کی حیثیت سے ملا کرتی تھی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس قسم کی الجھن اور عسرت کی زندگی گزارتے ہوں گے۔ اور انکو اپنی ضروریات اور ان بہت سی عادات میں تبدیلیاں کرنا پڑی ہوں گی۔

---

۲۔ نظم منیرؔ، صفحہ ۲۹۶

۳۔ پورٹ بلیر:- سیلولر کا تاریخی قطعہ جہاں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے بہت سے سپاہیوں نے برطانوی دور حکومت میں حبس دوام کی سزائیں کاٹی تھیں۔ مجبورے رنگ کی یہ تین منزلہ عمارت جو پورٹ بلیر کے شمالی سرے پر عین سمندر کے کنارے واقع ہر جنگ آزادی کے مجاہدوں کے مقید نہ ہونے والے جذبۂ آزادی کی ابھی تک ایک علامت بنی ہوئی ہے۔ سونیٹ اونچے مینار کے ساتھ یہ جیل ہر اس ہندوستانی کے لئے جو اس جزیرہ میں آتا ہے۔ ایک زیارت گاہ سے کم نہیں۔

جن کے وہ نوابین کے مصاحب اور شعر و سخن کے مسلم الثبوت استاد کی
حیثیت سے عادی رہ چکے تھے۔ خود ان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ
ان کے حقہ کی سٹک کپڑے کی بوسیدگی کی بدولت محض پیچ در پیچ لوہے کا
تار رہ گئی تھی۔ اور ان کا نیچا ٹوٹ پھوٹ گیا تھا کہ اچھے حقہ کی تلاش میں
اس کی مرمت ان کو خود کرنا پڑتی تھی۔ کیونکہ نیچے کے معاملہ میں نفاست پسندی
ان کو اپنے ہاتھ سے مرمت پر مجبور کرتی تھی۔ اچھی تمباکو بھی میسر نہ تھی۔ پھر بھی
یہی ایک شغلہ تھا کہ جس سے ان کو کسی قدر تسکین ہو جاتی تھی اور اس کے
دھوئیں میں وہ اپنی الجھنوں اور ملال کو اڑا دینے کی کوشش کرتے تھے۔

اس پریشان حالی کے دوران میں لباس کے متعلق اندازہ ہوتا ہے کہ
میر کو پہلے تو قیدیوں کے لباس میں رہنا پڑا جو ان کی نگاہ میں بالکل برہنہ پھرنے
کے ہم معنی تھا اور جس سے ان کے ذہن کو سخت اذیت پہونچتی تھی۔ جب
انھوں نے اس ملبوس کے خلاف وضع ہونے کا شکوہ کیا تو ان کو بجائے
آرام دہ ڈھیلے پائنچے کے پائجامے کے تنگ پائنچوں کے پائجامہ پہننے پر
مجبور کیا گیا۔ میر کے اپنے کپڑے سب پھٹ گئے تھے اور نئے معقول شریفانہ
لباس کی فکر بھی تھی کہ خوش قسمتی سے ان کی وزیر باندہ مرزا ولایت حسین سے
ملاقات ہوئی جو پہلے ہی سے میر کے خاص مہربانوں میں تھے اور ان کے
ساتھ ہی سیاسی اور انقلابی سرگرمیوں کے سلسلے میں فرخ آباد کے راستے میں
پکڑے گئے تھے۔ انڈمان میں جب دونوں کا ساتھ ہو گیا۔ تو انھوں نے میر
کے نئے کپڑے بنوا دئے مگر وہ کپڑے بھی کچھ دن کے بعد چوری ہو گئے۔

وہاں کی زندگی کے متعلق جیسا کہ میر کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر
کو بلا بستر کسی چبوترے پر سونا پڑتا تھا جو ضعیفی کے عالم میں سخت تکلیف دہ تھا۔ مگر

ناچار برداشت کرنا پڑتا تھا دوسرے سمندر کے زبردست و خوفناک شور سے بھی
رات کو نیند آنا مشکل ہو جاتی تھی کیونکہ سمندر کی موجیں ساحل پر آکر ٹکراتی تھیں ۔
کھانے پینے کے متعلق اندازہ ہوتا ہے کہ اُبالے ہوئے دال چاول کھانے کو دونوں
وقت ملتے تھے کیونکہ وہاں ارہر کی دال اور چاول کے سوا کچھ میسر نہ تھا ۔
گیہوں کا آٹا، گوشت، گڑ و شکر تقریباً عنقا تھا ۔ صرف جَو کا آٹا ملتا تھا، نمک
جو استعمال ہوتا تھا وہ سمندر کا نکلا ہوا کڑوا اور بے حد کھاری ہوتا تھا ۔ دودھ تو ایسی
چیزوں کو ان کی روح ترستی تھی ۔ منیر کے کلام میں ایک قطعہ تاریخ ایسا بھی
ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ایک صاحب "رحم علی خاں" اکثر
خالص دودھ بھجوا دیا کرتے تھے ۔ انسان تو انسان جانوروں کے لئے تازہ
گھاس نصیب نہ تھی ۔ ترکاری میں سوکھی گھاس ملتی تھی ۔

جزیرہ انڈمان کا موسم بھی بے حد خراب تھا ۔ وہاں تین ماہ گرمی اور باقی
نو ماہ برسات رہتی تھی جس سے آب ہوا مرطوب تھی اور گرمیوں میں دھوپ
ایسی نکلتی تھی کہ انگریزوں کا رنگ بھی کالا ہو جائے، اگر وہ لوگ دھوپ
میں باہر نکلیں ۔ خراب آب و ہوا ہونے کی وجہ سے طرح طرح کی
بیماریاں عام تھیں ۔ ایک طرف بیماریوں کی زیادتی اور دوسری طرف
دوا و علاج کا نام نہیں ۔ اور اگر کوئی بیمار ہو جائے تو یہ بھی ناممکن کہ رخصت
لے کر آرام کرے یا اپنے علاج کی طرف متوجہ ہو سکے ۔ چنانچہ منیر کو بھی
خارش ہو گئی جس سے کچہری میں تحریری کام کرنا بھی مشکل ہو گیا ۔ کیونکہ ہاتھ
سے کھجائیں یا بدن کھجلائیں اور کام کی کثرت کا یہ عالم کہ ایک لمحے کی فرصت
نہیں اور ایک دن کی بھی چھٹی ملنا ناممکن تھا ۔ ان تمام حالات کا تذکرہ
منیر نے اپنے کلام میں اس طرح کیا ہے ؎

ہر چند محابسوں میں کم وقعت ہیں | پر قیدیوں کے کفیل کیفیت ہیں
لکھتے ہیں رہائی و اسیری سب کی | ہم نقل نویس دفترِ قسمت ہیں [۴۵]

پہلے ہوئی چھ روپے ہماری تنخواہ | پھر آٹھ سے دس ہوئے خدا ہے آگاہ
ننانوے کا پھیر رہا قید میں بھی | لاحول ولا قوۃ الا باللہ [۴۶]

جس نے مرے پینے کی شکایت تاڑی ہے | کہتا ہے کہ جنگل کی جلی جھاڑی ہے
پکڑا انہیں اور پیچ باقی ہیں منیر | گویا ناگن نے کینچلی جھاڑی ہے [۴۷]

دم ناک میں عسرت سے ہو میرا کب تک | حقہ نہ ملے پینے کو اچھا کب تک
تا چند لپیٹوں دھجیاں نیچہ پر | بدلا کروں پوستِ استخواں کا کب تک [۴۸]

تمباکو بھی ہوا ہے کڑوا ہم سے | رک رک کے بولتا ہے حقہ ہم سے
برسات میں کس غضب کی گرمی ہے منیر | جھلوانے لگی آگ بھی پنکھا ہم سے [۴۹]

تنہا بیٹھو تو ہم دم کامل ہے | مجمع ہو اگر زینتِ محفل ہے
آسیبِ ملال اسکے دھوئیں سے بھاگا | حقہ نہ کہو فتیلہ عامل ہے [۵۰]

پہلے تو برہنہ تن پھرایا ہم کو | کپڑا الٹا پہنا کے اب دکھایا ہم کو
کیا پائنچے پہنیں چوڑیوں دار منیر | دنیا نے سہاگ کیوں جتایا ہم کو [۵۱]

زنداں میں جو بڑھ چلنے کے آہنگ ہوئے | کپڑے بھی ہم سے عازمِ جنگ ہوئے
ملبوس خلافِ وضع کے شکوے میں | کچھ عرض کیا تو پائنچے تنگ ہوئے [۵۲]

---

۴۵۔ نظم منیر صفحہ ۴۷۶
۴۶۔ نظم منیر صفحہ ۴۷۴
۴۷۔ نظم منیر صفحہ ۴۷۱
۴۸۔ نظم منیر صفحہ ۴۷۵
۴۹۔ نظم منیر صفحہ ۴۷۲
۵۰۔ نظم منیر صفحہ ۴۷۲
۵۱۔ نظم منیر صفحہ ۴۷۳
۵۲۔ نظم منیر صفحہ ۴۷۳

برہنگی میں مگر سب سے تھی سوا تکلیف ‏ ‏ وبال دوش ہوا تھا لباس انسانی
شفیق بندہ ولایت حسین مرزا نے ‏ ‏ کہ ہیں وہ دوست قدیمی برادر جانی
بنا دئے مجھے کپڑے بڑے تردد سے ‏ ‏ چھپا دئے مرے بالکل عیوب جسمانی
ہنوز صرف میں بھی اس قدر نہ آئے تھے ‏ ‏ چرا کے لے گئے غارت گران زندانی
یہاں کے چور وہ شاطر ہیں فن دزدی میں ‏ ‏ چرالیں آنکھ نہ سمجھے نگاہِ انسانی
یہ انکی چوری کی تاریخ کہہ دی ہاتف نے ‏ ‏ وہ کہنہ دزد چرالیں گے ثواب عریانی [52]

ہیں ضعف سے ہڈیاں عیاں سرتاپا ‏ ‏ سونے سے زمین کے بہت ہے ایذا
اکسیر ہے فرش خواب زنداں میں میر ‏ ‏ سونا ہے پلنگ کا نصیب اعدا [53]

نکل کر ہند سے آنا ہوا جب اس جزیرے میں ‏ ‏ اسیروں کی سیہ بختی سے کالا ہوگیا پانی
اگر اجناء میسر ہیں تو خود محتاج ہیں قیدی ‏ ‏ بڑی قسمت جو رنڈی دال مل جائے بآسانی
ابالی دال کو کتے بھی تے ناقہ سمجھتا ہے ‏ ‏ بکمے چاولوں کو جانتا ہے نفس کی سانی
میسر لحم مرغ دل ہے لیکن گوشت عنقا ہے ‏ ‏ چبائیں کیوں نہ پشت دست اس ٹاپو کی زندانی
سوائے لحمِ دل ممکن نہیں ہے عید اضحی کو ‏ ‏ اگر گاؤ زمیں ثور فلک کی بھی ہو قربانی
اگرچہ گندمی رنگوں کو پیسا اس جزیرے نے ‏ ‏ نہ پائی ایک دن بھی آدگندم کی ارزانی
کہو آرہ کشی یا مٹی کھودو، چکیاں پیسو ‏ ‏ اگر ہوں جاں بلب منہ میں نہ ٹپکائے کوئی پانی
سوا غارتی کے دانوں سے اسیر کی دال کی کثرت ‏ ‏ زیادہ آتخواں زردوں سے چاول کی فراوانی
لب شیریں کیسے بوسوں سے بھی بڑھکر کڑ کی قیمت ہے ‏ ‏ دہائیں صورت زیاد اگر سر پھوڑیں زندانی
شکر کے بدلے ریگ ساحل دریا ہزاروں من ‏ ‏ کرے کیا خاک کوئی یعوت مور ہیں سلیمانی
سمجھ کر شور محشر اسکو مردے چونک پڑتے ہیں ‏ ‏ یہ دریا خوشکن تا ہے کہ ہوتا ہے جگر پانی [54]

---

۵۳ نظم میر صفحہ ۴۷۳

۵۲ نظم میر صفحہ ۴۹۹

۵۴ نظم میر صفحہ ۱۱ و ۱۲

وہ گرمی ہے یہاں جو ہند میں موسم ہے سرما کا — حرارت دھوپ کی ہے دوزخ اجسام انسانی
گئی گرمی تو پھر برسات ٹھہری نو مہینے تک — اسی برسات سے ہے ہم شکل فصل ویرانی
یہاں اب باب لندن کی بھی رنگت تیرہ ہوتی ہے — بنے تنکی اگر نقرہ دکھائے اپنی جولانی[۵۶]

تحریر کچہری سے تو پنجہ مس ہے — کھجلانے کی خارش کو برابر دھن ہے
کیونکر لکھنے میں جسم کھجلاؤں منیر — افسوس انگشت خامہ بے ناخن ہے[۵۷]

طالع کی کمال نارسائی ٹھہری — خارش کی بدن سے آشنائی ٹھہری
ان دونوں میں صلح سخت مشکل ہے منیر — ناخن کی گوشت سے لڑائی ٹھہری[۵۸]

مندرجہ بالا روحانی اور جسمانی عام تکالیف کے باوجود جب کبھی موقعہ ملا تو منیر نے جزیرہ انڈمان میں بھی علمی شغلہ جاری رکھا۔ محرری کا کام کر لینے کے بعد فرصت کے اوقات میں منیر نے کتب بینی، تصنیف اور تالیف کا سلسلہ قائم رکھا اور انڈمان میں جہاں کہیں علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والی کوئی شخصیت نظر آئی۔ منیر نے اس سے رسم راہ پیدا کی۔ اور اپنے علمی شوق کو بیدار رکھنے کی کوشش کی۔ ان کے اس علم و فضل کی قدردانی کرنے والوں کی وہاں بھی کمی نہ تھی۔ جب "خوشی رام" نے جو کہ وہیں کے لوگوں میں تھے تاریخ انڈمان لکھی تو ان کو اس کی طرف رجوع کیا۔ منیر نے حسب ذیل تاریخ لکھی ؎

تصنیف کی جناب خوشی رام نے یہاں — جان خود کتاب ہے تاریخ انڈمین
روداد ہے جزائر دریائے شور کی — مطبوع شیخ و شاب ہے تاریخ انڈمین
موزوں کئے منیر نے یوں سال عیسوی — یکتا و لاجواب ہے تاریخ انڈمین[۵۹]
۱۸۹۱ء

---

۵۶ نظم منیر صفحہ ۱۳
۵۷ نظم منیر صفحہ ۷۰ / ۴۷
۵۸ نظم منیر صفحہ ۴۷۰
۵۹ نظم

خوب کی تصنیف تاریخ جدید    جسکے لاکھوں مدح خواں طالب کردر
نظم کر سال مسیحی اے منیر    ہے یہ بہتر تحفۂ دریائے شور[۶۰]

۱۸۶۱ء

خوشی رام کے علاوہ ان کی ملاقات کامل بلکہ اکمل روزگار مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی سے ہوگئی۔ جن سے حضرت غالب دہلوی کو فیض پہونچا تھا اور جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے سلسلہ میں انڈمان بھیج دیے گئے تھے۔ منیر مولانا کے فضل و کمال کے بے حد قائل تھے اور انڈمان میں ان سے ملاقات ہونے پر دن دراں ان کی صحبت میں رہتے تھے۔ اور علمی مسائل پر تبادلہ خیالات کیا کرتے تھے۔ منیر ایک قصیدہ میں جو انھوں نے حضرت سبط اکبر السید حسن علیہ السلام کی شان میں لکھا ہے۔ شاہ فضل حق کے فضل و کمال کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

مولوی بے نظیر فضل حق اسم شریف    دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و موتمن
قید میں میں اور وہ رہتے تھے ایک ہی جگہ    علم سمندر میں تھے غرقۂ بحر محن
نصف قصیدہ کیا سامنے انکے رقم    ختم ہوا جب تھے وہ ہمدم گور و کفن[۶۱]

منیر کسی نہ کسی صورت سے اپنی زندگی کے دن وہاں گزارتے رہے حتیٰ کہ ہندوستان میں فضل و کمال کے قدرشناسوں کی محفلوں میں ان کی یاد از سر نو تازہ ہوئی۔ ایک موقع پر نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور ان کے کلام سے

---

[۶۰] نظم منیر۔ صفحہ ۴۹۸    [۶۱] نظم منیر صفحہ ۵۰

ـــ نواب یوسف علی خاں :۔ یوسف علی خاں نام تخلص ناظم تھا۔ آپ ۵ ربیع الاول مطابق ۵ اپریل ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲ رجب ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء بروز دوشنبہ ریاست رامپور میں تخت نشین ہوئے۔ وہ نواب رامپور کے (باقی صفحہ ۸۰ پر)

بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے منیر کو واپس ہندوستان بلانے کے لئے انڈمان کی گورمنٹ سے لکھا پڑھی شروع کی۔ نواب کی کوشش کچھ عرصہ بعد بار آور ہوئی۔

نواب واجد علی شاہ کو منیر کے کلام کی طرف توجہ اور ان کی ذات سے دلچسپی کس طرح پیدا ہوئی۔ اس کی تفصیل انتظام اللہ شہابی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :-

" الہ آباد میں بعد فرو ہونے ہنگامہ (۱۸۵۷ء کے واقعات) کے جلسہ خیر خواہان برطانیہ کا منعقد ہوا۔ اس میں نواب یوسف علی خاں رئیس رامپور بھی شرکت کی غرض سے الہ آباد آئے۔ یہاں ایک گویا جو واجد علی شاہ کے پاس رہ چکا تھا۔ لکھنؤ سے الہ آباد آگیا تھا اور رہ پڑا تھا۔ نواب صاحب کے یہاں شام کو محفل سرود منعقد ہوئی۔ اس میں یہ گویا بھی

---

(بقیہ صفحہ ۷۹) سلسلے میں پانچویں فرمانروا تھے۔ زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۸۲ھ بروز جمعہ انتقال فرمایا۔ انھوں نے منیر کی غزل سن کر انڈمان سے بلانے کی کوشش کی تھی۔ مگر منیر کے دیدار کی حسرت پوری نہ ہو سکی۔ کیونکہ جب منیر آئے تو نواب سوئے عدم جا چکے تھے۔ اور ان کا یہ شعر سچائی کا حامل نہ ہو سکا۔

ناظم منیر آئے یہاں ہم ہیں قدرداں شرمندہ کیوں ہو اپنے کمالوں کے سامنے

نواب صاحب خود بھی اچھے شاعر تھے۔ اور شعراء و کملا کی دل سے عزت کرتے تھے۔ سروری نے ان کے لئے لکھا ہے :-

" مومن خاں کے شاگرد تھے بعد کو غالب سے اصلاح لیتے رہے۔ آخر میں میر مظفر علی اسیر کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔

گلہ۔ اردو کی ادبی تاریخ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری صفحہ ۱۹۹

طلب ہوا۔ اس نے گانے میں منیر کی مشہور غزل سُنائی ؎

"شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے"[۶۱]

نواب نے سن کر آخر لیا اور اس ردیف و قافیہ میں فرمایا ؎

"ناظم منیر آگئے یہاں ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے"[۶۲]

نواب یوسف علی خاں نے منیر کو اندمان خط لکھا۔ چنانچہ نواب صاحب کی محبت دیکھ کر بے چین ہو گئے جس کا ثبوت ایک خط سے جو "نظم منیر" میں صفحہ ۶۰۲، ۶۰۶ پر بہ زبان فارسی نواب صاحب ممدوح کے نام موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل جس کا مقطع ہے ؎

ناظم منیر آگئے یہاں ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

کسی فرخ آبادی دوست کی معرفت منیر کو پہونچی تھی۔ اس کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو جو عرضی میں درج ہے:۔

"در مقطع فیض منبع اشارہ بطلب ایں کس ریں چوں ہلال عید جلوہ نما است و توثیق وعدہ قدردانی در دامن تاکید گوہر آما۔ اگر باختیار خود بودے چشم و سرپائے صفوت مآل خدام دربار سودے قریب است

---

۶۱ یہ غزل منیر کے کلیات میں حاشیہ پر صفحہ ۲۰۲ پر درج ہے جس کا مطلع ہے۔
ثابت رہا فلک مرے نالوں کے سامنے ٹھہری ابر جاب کی بھاؤں کے سامنے
اور مقطع ہے ؎
بیرے ہنر کا کوئی نہیں قدرداں منیر شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے
۶۲۔ غدر کے چند علماء۔ انتظام اللہ شہابی۔ صفحہ ۸۲، ۸۳

کہ انشاء اللہ سدِ سکندری موانع از میاں برخیزد و رہائی مطلوبہ دست بدامنِ عالم آویزد۔" (نظم منیر صفحہ ۶۰۶)

یعنی مقطع میں" مجھے بلانے کا اشارہ ہے اور نذر انزائی کا وعدہ ہے۔ اگر میں آزاد ہوتا تو فوراً حاضرِ خدمت ہوتا۔ مگر آپ کی کوششوں کی بدولت امید ہے کہ انشاء اللہ مجبوریوں کی بلند دیواریں درمیان سے اٹھ جائیں گی اور میں جلد آپ تک پہنچ سکوں گا۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نواب رامپور کی کوشش کامیاب ہوئی اور کچھ ماہ کے بعد منیر کو حکم رہائی مل گیا اور وہ انڈمان سے ہندوستان کے لئے روانہ ہو گئے۔ مختلف مورخین کی تصانیف اور خود منیر کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ جزیرہ انڈمان کے شدائد اور مصائب سے ان کو ۱۵ صفر ۱۲۸۲ھ مطابق جون ۱۸۶۵ء بروز شنبہ نجات ملی۔ اپنی رہائی کے متعلق "نظم منیر" کے ایک قطعہ میں کہتے ہیں:-

آج میں نے قید سے پائی رہائی اے منیر — فضلِ حق سے یہ خوشی کی دوپہر مسعود ہو
اس جزیرے سے کلکتہ ہوتا ہوں رواں — اے خدا ہندوستاں کا اب سفر مسعود ہو
آکے بیٹھا ہوں جہازِ تیز رو پہ شکر ہے — لنگر اٹھا ساعتِ فتح و ظفر مسعود ہو
مادۂ منظور ہے کہنا دعائیہ مجھے — نیک ساعت ہو کو آپ کی نظر مسعود ہو
آج کے دن کی ہجریہ تاریخ صوری معنوی — روز شنبہ نیمۂ ماہِ صفر مسعود ہو

۱۲۸۲ھ

ایک دوسرے قطعہ تاریخ میں لکھتے ہیں:-

تھے قید ہم جزیرۂ دریائے شور میں — نیرنگ گردشِ فلکِ نیلہ رنگ سے
منشی تھے محکمہ میں کمشنر کے ہم وہاں — محفوظ تھے مشقتِ جیل و کلنگ سے

---

[۶۴] نظم منیر صفحہ ۵۰۲

انعام میں معاف ہوئے ہم کو دو برس — شکر خدا رہا ہوئے کام نہنگ سے
ہندوستان میں آکے رہے ہم پراگ میں — اب کانپور جاتے ہیں دل کی امنگ سے
مشتاق ہیں تماشائے جناب عروج کے — طے راہ شوق کرتے ہیں جست و شلنگ سے
کرتے ہیں صید آہوئے مضموں کی راہ میں — پایا فراغ صحبت گرگ و پلنگ سے
فضل خدا سے سال رہائی کہو منیر — اب ہم گھر آئے چھوٹ کے قید فرنگ سے[۵۶]

۱۲۸۲ھ

**منیر کی ہندوستان واپسی** جیسا کہ آخری گذشتہ قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ منیر خدا کا شکر کرتے ہوئے ۱۲۸۲ھ میں انڈمان کی قید سے رہائی پاکر کلکتہ ہوتے ہوئے الہ آباد آگئے۔ یہاں پہونچکر ان کو معلوم ہوا کہ ان کے قدردان اور رہائی میں ان کے لئے کوشش کرنے والے یوسف علی خاں والیٔ رامپور کا انتقال ہو چکا تھا۔ لہذا سفر رامپور کا اشتیاق پھیکا پڑ گیا۔ منیر نے اپنی جس غزل کو تضمین کر لیا تھا۔ حالات موجودہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس میں ایک بند کا اور اضافہ کیا ہے

آیا منیر چھوٹ کے جب قید سے یہاں — تھا قصد رامپور کو ہو جاؤں میں رواں
لیکن حضور ہو گئے راہی سوئے جناں — اب کس کے پاس جاؤں میں آکے کون قدرداں
نادم رہا میں اپنے کمالوں کے سامنے[۵۷]

انڈمان میں طرح طرح کی تکلیفوں کے باوجود بھی یہ آسانیاں مہیا تھیں کہ ہندوستان کے اعزا و اقربا سے خط و کتابت پر کوئی پابندی نہ تھی۔ منیر وہاں سے برابر خطوط ہندوستان لکھا کرتے تھے اور ہندوستان سے

---

۵۶۔ نظم منیر صفحہ ۱۰۵
۵۷۔ کلیات منیر صفحہ ۵۷۵ حاشیہ (در مطبع نامی گرامی ثمر ہند واقع لکھنؤ)

بھی خطوط ان کے پاس پہونچتے رہتے تھے۔ منیر کو اسی ذریعہ سے معلوم ہوا تھا کہ انکے شاگرد علی عباد نیاں اور میر غلام عباس رئیس باندہ الہ آباد ہی میں ہیں۔ چنانچہ ہندوستان آنے پر وہ الہ آباد میں میر غلام عباس کے یہاں ٹھہرے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد بیمار پڑ گئے اور حکیم خلیل الدین کے علاج سے شفا ملی۔ دوران بیماری میں ان کے شاگرد علی عباد نیاں نے جو الہ آباد میں اس وقت تحصیلدار تھے ان کی بہت خدمت کی۔ سنہ ۱۲۸۲ھ میں ہی منیر صحت یاب ہو گئے اور انھوں نے حسب ذیل الفاظ میں اپنے غسل صحت پر قطعہ تاریخ لکھا:-

ہم آئے بعد رہائی سوئے الہ آباد — ہماری راہبری طالع رسانے کی
حضور حضرت منشی غلام عباس آج — ملازمت دل مشتاق بے ریانے کی
نظر انھیں کی برادر نوازیوں پر تھی — جو ایسی راہبری طالع رسانے کی
انھیں کی ہمت عالی کے سامنے تسلیم — جھکا کے سر فلک عالم سخانے کی
زیارت شہدائے بھی وہ ہوئے ممتاز — کشش جو فیض شہنشاہ کربلانے کی
انھیں سے رونق بزم عزائے مولا ہے — انھیں سے کسب سعادت ہر اک ہمانے کی
میں انکی خدمت عالی میں خوش رہا لیکن — مصاحبت مری امراض جانگزانے کی
موافقت کے لئے بے خودی کبھی آئی — معاونت کبھی ضعف شکستہ پانے کی
اگرچہ یاس مجھے زندگی سے تھی مطلق — مگر حیات دوبارہ عطا خدانے کی
وحید عصر حکیم جمال خلیل الدین — انھیں کی روح اشارات پر شفانے کی
کیا انھوں نے مجھے اپنے لطف سے ممنون — بجا ہے ان کی جو خدمت مری دوانے کی
یہاں کے لطف عنایات نے کیا ممتاز — کہ آکے میری ملاقات پھر شفانے کی
منیر نے کہی تاریخ غسل صحت کی — شفا کمال ہی زیبا عطا خدانے کی

سنہ ۱۲۸۲ھ (نظم منیر صفحہ ۵۰۴)

صحت یاب ہونے پر منیر کو الہ آباد میں ذہنی سکون نہ ملا۔ وہ مالی حیثیت سے کسی قدر پریشان تھے۔ کیونکہ انڈمان سے واپسی پر ان کو کسی رئیس نے طلب نہیں کیا۔ اِدھر اُدھر خطوط روانہ کئے مگر سب کوشش رائگاں گئی۔ چنانچہ ۱۲۸۳ھ میں منیر الہ آباد سے لکھنؤ آئے۔ یہاں وہ اپنے پرانے دوستوں سے ملے اور اپنے استاد مرزا دبیر سے ملاقات کی۔ ان کے ہمراہ ایک مجلس جو گولہ گنج کے امام باڑے میں برپا ہوئی شرکت کی۔ اس مجلس کا ذکر افضل حسین ثابت نے اس طرح کیا ہے :-

"یہ ذکر ۱۲۸۳ھ کا ہے۔ اس سال منیر مرحوم لکھنؤ پہنچے اور اپنے دوستوں اور استاد مرزا دبیر مغفور سے ملے اور اس بڑی یادگار مجلس میں شریک ہوئے جو دارو غہ میر واجد علی شاہ صاحب تسخیر (نمیر خواہ کمپنی و گورنمنٹ) کے امام باڑہ واقع گولہ گنج لکھنؤ میں ہوئی تھی"[۶۶]

منیر نے لکھنؤ میں زیادہ قیام نہیں کیا بلکہ اسی سال کانپور مولانا احمد حسن خاں عروج کے پاس چلے گئے۔ جن کے لئے انھوں نے جزائر انڈمان سے روانگی پر راستہ میں ایک قصیدہ لکھا تھا اور جس میں انھوں نے ان کی تعریف کے علاوہ اپنی پریشانیوں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ کانپور پہونچکر یہ قصیدہ ان کی خدمت میں پیش کیا جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں سے

بارے آئی نجات کی باری ۔۔۔ کھل گیا عقدۂ گرفتاری
ہم کو منصب ملا رہائی کا ۔۔۔ قید کو جا شیدانہ بیکاری
سوئے عروج ٹھہرا انتقام نوبت سے ۔۔۔ اب وطن چلنے کی ہے طیاری
رخصت اے دوستانِ زندانی ۔۔۔ الوداع اے غمِ گرفتاری

---

۶۶۔ دربار حسین۔ المعروف بہ چراغ مجالس از ثابت صاحب صفحہ ۴۲۔

دال چاول سے کہہ دو رخصت ہوں — پانی میں ڈوبے یہ نمک کھاری
مچھلیوں سے کہو کہ ہٹ کے سڑیں — گھاس کھودے یہاں کی ترکاری
چینی، برہما، ملائی، مدراسی — اہل آسام جنگلی تاتاری
اپنے دیدار سے معاف کریں — اپنی باتوں سے دیں سبکباری
کالے پانی سے ہوتے ہیں رخصت — اشک شادی ہیں آنکھوں سے جاری
بیٹھتے ہیں جہاز دودی پر — اٹھتے ہیں لنگر گرانباری
نکلے دریائے شور سے صد شکر — بحر شیریں کی آگئی باری
نظر آیا سواد کلکتہ — شکر ہے شکر حضرت باری
ہے ارادہ کہ فکر شعر کروں — تاکہ ہو دور رنج بیکاری
بسکہ برسوں رہا ہوں زنداں میں — بھولی قصر سخن کی معماری
اجنبی ہیں دل و دماغ اس سے — فکر کو بھی ہے عذر ناداری
ایک مضمون بھی نہ ہاتھ آیا — فکر کرکے ہو گیا عاری
ناگہاں میری عقل نے یہ کہا — کیوں اٹھاتا ہے رنج بیداری
اب کہاں وصل شاہد مضمون — ہو چکی پہلے گرم بازاری
ہے جناب عروج میں اس کو — فخرِ منصب پرستاری
وہ مسیحائے آسمانِ سخن — جہل کی جس نے کھوئی بیماری
نظم کر ایسے دوست کے اوصاف — ہے اگر تجھ کو دعوئے یاری
یوں پڑھیں تیرے آگے اپنے شعر — عرفی و انوری و مختاری
جیسے رضواں کے آگے جنت میں — کوئی کھولے دکان عطاری
سامنے تیرے شعر محکم کے — ہر سخن ور کی لغو گفتاری
عہد زندان عاقبت دشمن — وعدۂ شاہدان بازاری

حاسدوں کے جگر میں تیرا شعر — رانعِ ظلمتِ سیہ کاری
اس طرح ہو کہ جس طرح ہمان — گھر میں بارود کے ہو چنگاری
دل سخن حضرتِ ظہوری کا — ہو ترے وصفِ خاص میں جاری
از نمک پاشیِ تکلم تو — عالمے کشتۂ دل انگاری
داستانِ تو گشتہ کام نواز — سخنے نیست در لب آزاری
عذر مقبول کر کہ تھا بر سبیل — نسبتۂ رشتۂ گرفتاری
گو کہ کاسد ہو یہ متاعِ سخن — تو کرے گا مگر خریداری
یہی تحفہ سفر سے لایا ہوں — ہے تہی دستی اور ناچاری
دین و دنیا میں نور ہے شاہ ال — بخت و دولت کریں تری یاری
کیا منیر اور التماس کرے — فکر قاصر ہے نطق ہے عاری

(کلیات منیر، صفحہ ۹۷ تا ۱۰۱)

منیر نے احمد حسن عروج کے پاس کانپور میں بھی زیادہ قیام نہیں کیا۔ ارادہ کیا کہ فرخ آباد جائیں اور پرانے دوستوں سے ملیں۔ لیکن کانپور سے کچھ ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ بغیر کسی اور طرف سفر کئے ہوئے وہ کانپور سے سنہ ۱۲۸۲ء میں ہی الہ آباد واپس آگئے اور میر غلام عباس کے یہاں ٹھہرے اسی عرصے میں انھوں نے کچھ خطوط اِدھر اُدھر لکھے جو آج ان کی زندگی کے آئینہ دار بن گئے۔ کچھ خطوط کی عبارت حسب ذیل ہے :-

ایک خط میں جو انھوں نے ۱۰ صفر سنہ ۱۲۸۳ء کو جناب مولوی سید علی ضامن صاحب شوق کو لکھا لکھتے ہیں :

"بیدرنگ تو انل اندہ و حرماں از لکھنؤ رخت عزیمت بربستہ عرو ری چند در کانپور آسودہ زان پس در الہ آباد یا افراز غربت کشادم ہنوز

ہمدریں معمورہ ابجد تجریدی نگارم"

(نظم منیر صفحہ ۱۵۵)

ایک دوسرے خط میں جو انھوں نے جناب آغا سید حسین مرزا شوق کو ۱۲ ربیع ۱۲۸۳ھ کو لکھا تحریر کرتے ہیں:-

"ایں ننگ نکونات از لکھنؤ بدر زدہ لخیتے در کانپور خدمت محقق عدیم البدل مجموع الفضائل والاحسان جناب منشی و مولوی احمد حسن خاں بہادر عروج آرمیدہ و فرخ آباد نادیدہ سمت الہ آباد پائے خاکی نمود حالیا اندریں وحشت آباد نقش بوریائے عزلت است"

الہ آباد میں بھی منیر کا دل نہیں لگا مگر جاتے بھی تو کہاں جاتے مجبور تھے کہ وہیں قیام کریں۔ چنانچہ انھوں نے ۱۲۸۳ھ سے مثنوی "معراج لمضامین" لکھنا شروع کر دی اور انھوں نے کسی نہ کسی طرح ۱۲۸۷ھ تک الہ آباد میں قیام کیا۔ اسی درمیان میں الہ آباد میں ان کو ایک آدھ قدردان بھی ملا جس کا ذکر ان کے کلام میں ملتا ہے۔ مثلاً جب سید ناصر علی خاں ذوالقدر سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے ان کی بہت عزت افزائی کی اور انکی پسندیدہ شے یعنی آم ان کو خوب جی بھر کے کھلائے جس کا تذکرہ وہ مندرجہ ذیل قطعہ میں اس طرح کرتے ہیں ؎

| | |
|---|---|
| برسوں سے آم کھانے کی حسرت تھی | اس میوہ کے ساتھ دل لگا ہے تھا لو |
| اب ہند میں آئے تو تہی دستی سے | تھی جنس ہوس دکان حرماں میں گرد |
| ذوالقدر بہادر کی عنایت کے سبب | حاصل ہوئے آم خوب تر بے تگ و دو |
| بہتر سے بہتر آم کھلوائے مجھے | ہر قسم کے ہر دیار کے تازہ و نو |
| نام ان سے حلاوت و صورت میں | قند لب شیریں و ترنج خسرو |

تاریخ اس میوہ کی کہی میں نے منیر     سیلب: ذتق حود ہے یہ میوۂ نو[۵۸]

دورانِ قیام الہ آباد میں انھوں نے نوابین اور ریاستِ وقت سے رشتہ منقطع نہیں کیا بلکہ نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور سے راہ و رسم بذریعہ خط و کتابت پیدا کی۔ جن کے والد ان کے فضل و کمال کے خاص قدردان تھے اور قید انڈمان سے رہائی دلانے میں بھی کوشش کی تھی اور ایک بار انھوں نے جنگ آزادی سے پہلے منیر کو اپنے یہاں بلانے کی بھی کوشش کی تھی مگر منیر اپنی کچھ مجبوریوں کی وجہ سے نہ جا سکے تھے۔ انھوں نے سفر خرچ واپس کر دیا تھا اور ساتھ میں ایک قطعہ بھی بھیجا تھا جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نا چار پھیرتا ہوں عطیہ حضور کا     عرضی میں ہے یہ حال مفصل لکھا ہوا
ہو میری یاد بعد محرم تو خوب ہے     اس وقت مرحمت ہو جو کچھ اب عطا ہوا
دربار میں منیر غزل خوانیاں کرے     طوطی حضور ہوں لیں یہ بولتا ہوا[۵۹]

نواب یوسف علی خاں کی حسرت تو پوری نہ ہوئی۔ لیکن انڈمان سے واپسی کے بعد منیر نے بذریعہ خط و کتابت نوابین رامپور سے دوبارہ رشتہ جوڑنے کی کوشش کی۔ چنانچہ جب نواب کلب علی خاں کے لڑکے کی شادی کی خبر سنی تو انھوں نے اس موقع پر ایک قطعہ تاریخ بھیجا جس کے مندرجہ ذیل شعر میں انھوں نے نواب صاحب کو اپنی خستہ حالی کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ؎

---

۵۸۔ کلیات منیر صفحہ ۵۰۷

۵۹۔ دیوان اول بنام منتخب العالم صفحہ ۲۸

دور کر میری سیہ روزی بھی اے نورِ خدا
جلوہ گر ظلمت کدہ پر ہو بسانِ آفتاب

نواب کلب علی خاں کے یہاں شادی کی تقریب جب ختم ہوئی تو انھوں نے ۲۴ شعبان المعظم ۱۲۸۷ھ کو بلانے کا خط منیر کو لکھا اور ۴ رمضان المبارک ۱۲۸۷ھ کو الہ آباد ایک سو روپیہ سفر خرچ بھی روانہ کیا۔ چنانچہ منیر نے الہ آباد کو خیرباد کہا اور بعد رمضان رامپور روانہ ہو گئے۔ موجودہ نواب رامپور کی قدردانی سے متاثر ہو کر اپنے قدیم مخمس میں مندرجہ ذیل بند کا اضافہ کیا۔

نواب پاک کلب علی خاں نے اے منیر بلوا کے رامپور میں کی بخشش کثیر

---

ع۔ نواب کلب علی خاں:- ان کا عہد ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۵ء سے شروع ہوتا ہے انھوں نے اپنے والد بزرگوار سے زیادہ اردو شاعری کو رامپور میں چمکایا۔ ان کا مبارک عہد ادبی حیثیت سے رامپور کا زریں عہد کہا جا سکتا ہے۔ نواب صاحب خود بھی شاعر تھے۔ امیر مینائی کو کلام دکھاتے تھے نواب تخلص تھا ان کو تحقیق لفظی کا بہت شوق تھا اور جب ان کے یہاں ادبی محفلیں منعقد ہوتی تھیں تو ان میں الفاظ پر اکثر بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا جس میں شریک ہونے والے تسلیم، جلال، بحر اور منیر شکوہ آبادی تھے۔ ان مشہور شعرا کے نام جو دربار رامپور سے تعلق رکھتے تھے حسب ذیل ہیں:-

اسیر، بحر، امیر مینائی۔ داغ، جلال، تسلیم، منیر، قلق، عروج، حیا۔ جان صاحب، شرف۔ آتش، شاغل، شاداں، عشق، ضیا۔ بشیر، منصور اور رضا وغیرہ۔

نواب کلب علی خاں کے لڑکے کے جشن ولادت کے موقع پر ایک قصیدہ تہنیت منیر نے لکھ کر بھیجا تھا جس کا مطلع حسب ذیل ہے۔

تو ماہِ ماہِ عید جو افلاک پر عیاں ہوتے ہیں پیر فرطِ محبت سے نوجواں

اس قصیدہ کے کچھ دن کے بعد نواب نے منیر کو اپنے دربار میں بلایا۔

صدشکر آئے راہ پہ اب طالع فقیر   ہے قدرداں مرا یہ امیر فلک سریر
اب سرخرو ہوں اپنے کمالوں کے سامنے

**منیر اور رامپور**

یوں تو رامپور ایک چھوٹی ریاست تھی۔ مگر اس ریاست کو انیسویں صدی میں شعر و ادب کے چرچے کی وجہ سے غیر معمولی عروج حاصل ہوا۔ شعر و ادب کی جو نئی بستیاں بسیں ان میں رام پور کی خاص اہمیت ہے۔ دلی لکھنؤ سے سیلاب حوادث نے بہا کر جن شعرا اور ادیبوں کو رامپور پہنچایا۔ ان کو وہاں کے نواب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چونکہ رامپور، دلی اور لکھنؤ بہ مقابلہ کسی دوسرے ادبی مرکز کے دونوں سے قریب پڑتا ہے۔ اس لئے دونوں جگہ کے شاعر یہیں جمع ہو گئے۔ علاوہ ازیں وہاں کے فرمانروا یعنی نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں بڑے علم دوست تھے۔ دلی کے شعراء میں داغ اور لکھنؤ کے شعراء میں امیر، جلالی اور تسلیم وغیرہ کھنچ کر رامپور آ گئے تھے اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد دیگر شعرا مثلاً امداد علی بحر، آتش کے شاگرد، نسرت اور ناسخ کے کئی سربرآوردہ شاگرد یعنی انس اور منیر وغیرہ رامپور آ گئے تھے اور ریاست میں مختلف خدمات ان کے سپرد کر دی گئی تھیں۔ اس سلسلے میں عبدالقادر سروری نے نے لکھا ہے:۔

"شاعروں کے زمرہ میں کسی کو ملازم رکھنے کے بجائے مختلف محکموں میں ملازم رکھ لیتے اور سلوک بھی کیا کرتے تھے۔ مقربین کے رہنے کے لئے ایک کوٹھی الگ بنا رکھی تھی جو مصاحب منزل کے نام سے موسوم تھی۔ رامپور میں ناسخ اور آتش کے شاگرد اپنے اختلافات کے باوجود ایک ساتھ رہنے پر مجبور تھے۔ رفتہ رفتہ

وہ ایک طرح سے سوچنے لگے تھے۔[۱]

حتیٰ کہ لکھنؤ کے وہ مخصوص اثرات جن سے کسی حد تک لکھنوی اندازِ سخن بدنام ہو گیا تھا، مفقود ہو گئے۔ لکھنؤ اور دہلی نے مل جل کر ایک نئے اور خوش گوار طرزِ بیان کی بنیاد ڈالی اور لکھنؤ کے سخن گو شعراء پر دلی کے شعراء کے کلام کا اور دلی کے شعراء پر لکھنؤ کے اندازِ بیان کا خاص اثر پڑا۔ جس نے دونوں دبستانوں کی شاعری کی خصوصیات میں لطافت، متانت اور سنجیدگی کا اضافہ کیا۔

شعر و سخن کے علاوہ رامپور کے دربار میں علم و حکمت کے ہر شعبہ کے ممتاز کاملانِ فن کی قدر دانی عام تھی اور شعرا کی سرگرمیوں کے علاوہ حکماء اور فضلا کی محفلیں بھی سرگرم رہا کرتی تھیں۔ منیر کی زبانی وہاں کے عالموں، حکیموں، طبیبوں اور حافظوں کا حال سنیئے:

علماء ایسے نام ور ہیں یہاں — جنکی مداح خلق ہے ساری
حکمائے فلاسفہ کو بھی — فخر ہے ان کی کفش برداری
وہ اطبا ہیں عیسوی اعجاز — نام سے جن کے بھاگے بیماری
فردیکتا حکیم ابراہیم — کرے بقراط جن کی عطاری
حافظوں کا شمار حد سے فزوں — شرح کرنے میں حد کی دشواری
الغرض ہیں تمام اہلِ کمال — صاحبِ منصب نمک خواری
مجمعِ شاعرانِ نامی ہے — شاعری کی ہے گرم بازاری
بحرِ منشی اسیر اور امیر — ہمسر انوری و مختاری
طبعِ پاکِ عروج و داغ سے ہے — منفعل ابر کی گہر باری
ہیں جلال و حیا و خواجہ بشیر — محفلِ نظم جلوہ گر ساری

---

[۱] اردو کی ادبی تاریخ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری

فن تاریخ میں رسا منصور — جان صاحب کی ریختی پیاری
سب سے بڑھ کر میر کو حاصل — بے کمالی و ہرزہ گفتاری[۱]

رامپور کے دربار میں بڑے بڑے حکماء اور علماء کا مجمع تھا۔ علم و ہنر کی ترقی کے ساتھ ساتھ صنعتوں و حرفتوں کا رواج بھی ترقی پر تھا۔ دستکاری کے ماہرین بھی بلا کر جمع کئے گئے تھے۔ اور ان سے پوری طرح استفادہ کی کوشش کی جاتی تھی۔ علوم عربیہ کے بھی کامل الفن اور مسلم الثبوت استاد رامپور میں موجود تھے۔ مثلاً مفتی محمد سعد اللہ، مولوی عبد العلی ریاضی داں وغیرہ وغیرہ وہ لوگ تھے۔ جن کی قابلیت کی ہر طرف شہرت تھی۔

اس عہد میں رامپور میں زندگی کا نقشہ زیادہ تر عیش و نشاط سے بھرپور اور علمی سرگرمیوں کا حامل تھا۔ آئے دن شعر و شاعری کے چرچے، میلے ٹھیلے وغیرہ ہوتے رہتے تھے۔ شاعرے، میلے وغیرہ میں نواب صاحب برابر شرکت کرتے تھے۔ میلے کے زمانے میں بھی نواب صاحب کے اوقات بدستور منظم رہتے۔ علماء اور شعراء وغیرہ کی صحبتیں اپنے اپنے اوقات پر برابر جاری رہتی تھیں۔ میلے کی خصوصیات میں ایک صحبت شعر و سخن بھی تھی جو میلے کے پانچویں دن منعقد ہوتی تھی۔ بیرونی شعراء کو دعوت نامے جاتے اور اندرونی شعراء بھی برابر شرکت کرتے تھے۔ "مادھو رام" نے اس عہد کے رامپور کا نقشہ نہایت حسین الفاظ میں پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کا زمانہ بھی عجیب زمانہ تھا کہ دار الاقتدار ایک گلشن جانفزا تھا اور حضرت تیر، اسیر، امیر، داغ، جلال اور تسلیم وغیرہ وغیرہ کے سے شیریں گفتار اسکے طوطی خوش الحان

---

[۱] نظم منیر صفحہ ۹۲

میں لکھا ہے :-

"مدفن کے متعلق جان صاحب کے نواسے محمد حسین صاحب سے معلوم ہوا کہ منیر شکوہ آبادی باغ مہدی علی خاں کے مقبرے میں دفن ہوئے لیکن منیر صاحب کے پوتے سید محمد محسن صاحب سے معلوم ہوا کہ جناب منیر سرائے دروازہ کے متصل کوچہ چاراں کے پاس مسجد لاڈلی جان میں دفن ہوئے۔ میری رائے میں سید محمد محسن صاحب کا بیان بوجہ رشتہ قابل ترجیح ہے"[ثلہ]

---

ثلہ مسدس تہنیت جشن بے نظیر مصنفہ میر یار علی جان صاحب، مرتبہ محمد علی خاں اثر صفحہ ۹ طبع اول ۱۹۵۰ء

# باب دوم

## تصانیف منیرؔ شکوہ آبادی

منیرؔ نے اپنی زندگی میں تقریباً پچاس ساٹھ ہزار اشعار ضرور کہے مگر کلام کا بیشتر حصہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے اور دیگر پریشان حالیوں اور کسی ایک جگہ قائم نہ ہونے کی وجہ سے تلف ہوگیا تاہم جو کلام ہم تک پہونچا ہے اس کی مجموعی تعداد ۲۷ ہزار سے کم نہیں۔ ان کے حسب ذیل تین مطبوعہ دیوان موجود ہیں جن کے نام منیرؔ کی تاریخ گوئی سے دلچسپی کی وجہ سے سب تاریخی ہیں اور ان کے سنہ ترتیب و تدوین کا پتہ دیتے ہیں:

۱۔ دیوان اول موسوم بہ "منتخب الفوائد" سنہ ۱۲۶۴ھ (سنہ ۱۸۴۷ء)
۲۔ دیوان دوم موسوم بہ "تنویر اشعار" سنہ ۱۲۶۹ھ (سنہ ۱۸۵۳ء)
۳۔ دیوان سوم۔ موسوم بہ "نظم منیر" سنہ ۱۲۹۰ھ (سنہ ۱۸۷۳ء)

اس کے علاوہ ایک مذہبی مثنوی بنام "معراج المضامین" سنہ ۱۲۸۶ھ میں چھپی۔ دوسری بیانیہ مثنوی "ہرمزی خانم" دیوان سوم میں شامل ہے مگر اب اس مثنوی کو کتاب خانہ دانش محل دہلی نے الگ بھی چھاپ دیا ہے۔
ان مثنویوں کے علاوہ دو نثر کی کتابیں بھی ہیں۔ ایک تنقیدی تصنیف

جس کا نام "نان دل خراش" ہے۔ قلمی نسخہ کی صورت میں ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی میں موجود ہے اس کتاب میں ان اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں جو انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری پر کئے گئے تھے۔ دوسری نثر کی کتاب "داستان طلسم گوہر بار" ہے جو گورنمنٹ لائبریری رامپور میں قلمی نسخہ کی صورت میں موجود ہے یہ ایک پرانے طرز کی داستان کی کتاب ہے۔ (ان سب تصانیف پر مفصل تبصرہ آئندہ باب میں کیا جائے گا)

کچھ اور کتابیں بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ لیکن ان کے نسخے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے نظر سے نہیں گزر سکے۔ مثلاً رسالہ اعلان الحق و سراج المنیر۔ رسالہ تنبیہ الشاکین بفضائل الثقلین و کتاب امان المومنین عن مکائد الشیاطین۔

مندرجہ بالا رسائل و کتب کے نام انھوں نے خود اپنی تصانیف کے سلسلے میں دیوان اول کے دیباچہ میں لکھے ہیں۔ مثنوی "معراج المضامین" کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے دو دیوان اس سے پہلے ضائع ہو چکے تھے۔ ان میں ایک چوری ہو گیا تھا اور دوسرا آشنگی معاش کے پیش نظر کسی معزت خور شاعر کے ہاتھ بیچ ڈالا گیا تھا۔ اس طرح سے دس جزو کی ایک مثنوی بھی فروخت کی تھی۔ معراج المضامین کا دوسرا حصہ بھی تیار کیا تھا۔ جس میں تقریباً ۲۵۰۰ اشعار تھے مگر اس حصہ کا صحیح پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہوا۔ منیر کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ ورنہ آج چھ سات دیوان موجود ہوتے۔ مگر اب صرف تین دیوان ملتے ہیں۔ ان کی تصانیف کے سلسلے میں ڈاکٹر حسین فاروقی لکھتے ہیں:

"منیر کے دو دیوان چوری ہو گئے۔ دو انھوں نے بیچ ڈالے۔ مرائی سب کے سب فروخت کر دیے۔ تین مثنویاں خریدار دل

کی نذر ہوگئی لیکن اس کے باوجود ان کا جو کلام باقی ہے وہ تیس ہزار اشعار سے کم پر مشتمل نہیں ہے[۲۶]"۔

**منتخب العالم** منیر کا پہلا دیوان ۱۲۶۴ھ میں ترتیب دیا گیا۔ جبکہ منیر باندہ میں تھے۔ اس وقت ان کی عمر پچیس سال کی تھی۔ دیوان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب ۱۲۶۴ھ میں ہوگئی تھی مگر کلام میں اضافہ ۱۲۶۹ھ تک ہوتا رہا۔ مثلاً ایک عرضی اس دیوان میں ملتی ہے جو ۱۲۶۵ھ میں نواب علی بہادر کو لکھی گئی ہے۔ اشاعت اول کا کوئی نسخہ الگ دستیاب نہیں ہوا۔ صرف جو کلیات لکھنؤ میں ۱۲۹۶ھ میں چھپا وہ موجود ہے۔ لہذا جو تفصیلات دی جارہی ہیں۔ ان کا تعلق اشاعت دوئم سے ہے جو ۱۳۲۲ھ میں مطبع سیدی رامپور میں طبع ہوا

گشت چو نایاب کلام شریف — شاعر بے مثل جناب منیر
باز بطبع آمدہ صادق بگفت — سنہ نو کیا یافت کتاب منیر
۱۳۲۲ھ

مندرجہ بالا قطعہ دیوان کے پہلے صفحہ پر درج ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منیر کے کلام کی مقبولیت روزافزوں تھی۔ لیکن ان کے مطبوعہ دیوان کا کوئی نسخہ آسانی دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اس دیوان کی طباعت کا دوبارہ اہتمام کیا گیا تھا۔ تاریخی قطعہ کے بعد حسب ذیل عبارت ایک مہر کی صورت میں درج ہے:-

"در عہد معدلت مہد بندگان عالی اعلیٰ حضرت حضور پرنور عالی جناب

---

[۲۶] تنقید شبلی۔ ہفت روزہ۔ ایڈیٹر کریم انصاری لکھنؤ۔ مقالہ" منیر شکوہ آبادی" ذاکر حسین فاروقی ریسرچ

معلی القاب میجر نواب محمد حامد علی خاں بہادر فرزند دلپذیر دولت
انگلشیہ فرمانروائے ریاست رامپور دام اقبالہم بتوجہ خاص
عالی جناب صاحبزادہ مصطفےٰ علی خاں صاحب بہادر ہوم سکریٹری"

دیوان کے شروع میں سات صفحوں کا فارسی دیباچہ ہے جس میں منیر نے اپنے حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ دیباچہ کے بعد مناجات ہیں پھر قصائد کا سلسلہ ہے۔ جن کی تعداد پانچ ہے۔ جس میں دو مذہبی قصیدے ہیں تین امراء و رؤساء کی شان میں ہیں۔ قصائد کے بعد بارہ قطعات درج ہیں اس کے بعد غزلیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جن کی کل تعداد ۱۹۴ ہے۔ گیارہ مخمس ہیں۔ سینتالیس رباعیات ہیں اور قطعات تاریخ چالیس ہیں۔ آخر میں وہ قطعات تاریخی ہیں جو مختلف حضرات نے دیوان کی تکمیل کے سلسلے میں کہے ہیں۔ اس دیوان میں تقریباً پانچ ہزار نو سو اشعار ہیں۔

**تنویر الاشعار**

یہ منیر کا دوسرا دیوان ہے جو باندہ میں ۱۲۶۹ھ میں پہلی مرتبہ ترتیب دیا گیا۔ دیوان کے آخر میں منیر شکوہ آبادی خود کہتے ہیں ؎

ہوا صد شکر دیوان دوم ختم — پسند آیا نہ اس میں طول گفتار
منیر اب نام تاریخی کی تھی فکر — کہا دل نے کہو تنویر الاشعار

۱۲۶۹ھ — صفحہ ۲۵۱

یہ دیوان پہلی مرتبہ علیٰحدہ کب شائع ہوا اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا لیکن اس کی اشاعت دوم ۱۳۲۵ھ میں ہوئی۔ اس نسخہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان نواب حامد علی خاں والئ رامپور کے عہد میں محمد مصطفےٰ علی خاں کی سرپرستی میں اور خواجہ صادق حسین صاحب اور محمد سعید اللہ خاں عاشق کے اہتمام سے مطبع

سعیدی رامپور میں طبع ہوا تھا۔ اس دیوان کے صفحہ ۲۵۲ پر جناب مولوی احسان علی خاں احسان رامپوری کا ایک قطعہ بھی ملتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۱۳۲۴ھ میں دوبارہ اشاعت کے لئے دے دیا گیا تھا۔ اور ۱۳۲۵ھ میں طبع ہو کر شائع کیا گیا۔ قطعہ حسب ذیل ہے

"قطعہ تاریخ طبع ثانی کلیات منیر مرحوم از نتائج افکار گوہر بار محاسن صوری و معنوی جناب مولوی احسان علی خاں احسان رامپوری تلمیذ حضرت داغ دہلوی مرحوم :-

پھر دوبارہ چھپا کلام منیر  تھا فنِ سخن میں جس کا نظیر

جستجو میں تھے اسکی اہلِ مذاق  اسکے جویاں تھے سب صغیر و کبیر

سُن کے یہ مژدۂ مسرت بخش  شادماں ہو ہر اک غریب و امیر

گلِ مضمون شگفتہ ہیں لاکھوں  نیرا دل سے لے کے تا بہ اخیر

لکھا یہ سالِ طبع احساں نے  صحنِ گلشن ہے کلیاتِ منیر

۱۳۲۴ھ

منیر کے تاریخی مصرعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دیوان ۱۲۹۹ھ میں مکمل کر لیا تھا۔ لیکن وہ تین سال بعد تک کا کلام بھی اشاعت سے قبل اس دیوان میں شامل کر لیا تھا۔

اس دیوان میں صرف ایک قصیدہ ہے۔ جس میں "بارھویں امام علیہ السلام" کی مدح کی گئی ہے۔ یہ قصیدہ ۱۲۷۰ھ میں کہا تھا۔ انھوں نے "حضرت امام مہدی آخر الزماں علیہ السلام" کی شان میں متعدد قصیدے لکھے ہیں۔ ایسا عقیدہ ہے کہ جب ان امام کا ظہور ہوگا تو قیامت آجائے گی۔ چنانچہ منیر پریشانیوں سے تنگ آ گئے تھے اور قیامت کے منتظر رہتے تھے۔ قصیدہ

کے حسب ذیل آخری شعر سے سنہ تصنیف کا اندازہ ہوجاتا ہے ؎
تاریخ اس قصیدہ کی تصنیف سے سنو قائم ہو وصف پاک شہ بے مثال کا
۱۲۷۲ھ

اظہار تمنا کے سلسلہ میں اپنی زندگی میں ظہور امام مہدی علیہ السلام کے متمنی ہیں اور اپنی پریشانی کے عالم کو قصیدہ کے آخر میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

مولا مرے مجھے نہیں اب تاب صبر کی کوہ گراں اٹھا مرے دل سے ملال کا

قصیدہ کے بعد غزلیات شروع ہوتی ہیں۔ جن کی تعداد کل ۱۳۵ ہے۔ غزلوں کے بعد تضمین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جن کی تعداد چھ ہے۔ پھر پندرہ مخمس ہیں۔ بارہ رباعیات ہیں۔ پھر قطعات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جس میں بیشتر تاریخیں ہیں اور ان کی تعداد ساٹھ ہے۔

**نظم منیر** یہ منیر کا تیسرا دیوان ہے جو ۱۲۹۰ھ میں رام پور میں ترتیب دیا گیا۔ اس میں دس ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔ یہ دیوان بھی بہ عہد عالی جناب نواب محمد حامد علی خاں صاحب بہادر والی ریاست رامپور بسرپرستی عالیجناب صاحبزادہ محمد مصطفےٰ علی خانصاحب بہادر پرائیوٹ سکریٹری باہتمام خواجہ صادق حسین صاحب محمد سعید اللہ خاں عاشق مطبع سیدی رام پور میں ۱۲۹۶ھ میں چھپا

اول فارسی میں آٹھ صفحات کا دیباچہ ہے جس میں اپنے طرز کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد قصائد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے پہلا قصیدہ "فریاد زندانی" در نعت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم دو معرکۃ الآرا قصیدہ ہے جس میں منیر نے جزیرہ انڈمان کی تاریخ اور اپنے مصائب کی تفصیل بیان کی ہے اس کے علاوہ کچھ مذہبی قصائد ہیں۔ اور اٹھارہ قصیدے امراء و روساء

کی زبان اور دیگر موضوعات پر ہیں۔ پھر ۱۶ عرائض کا سلسلہ ہے جو مختلف رؤسا اور امراء کے نام لکھے گئے ہیں جن کی تعداد سات ہے۔ پھر کچھ قطعات تاریخ ہیں۔ اس کے بعد ۶۷ غزلیات ہیں۔ پھر ۸۳ رباعیات ہیں۔ رباعیات کے بعد تاریخی قطعات ہیں۔ جن کی تعداد تقریباً ۲۹۰ ہے۔ پھر ایک غزل خاتمہ دیوان سے متعلق ہے۔ مثنوی "حجاب زناں" (جو الگ بھی چھپی ہے) بھی اس دیوان میں شامل ہے جو صفحہ ۵۵۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۵۹۵ پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد نثر کا حصہ شروع ہوتا ہے۔ چند فارسی خطوط ہیں جو انھوں نے مختلف لوگوں کو لکھے ہیں اور جن سے ان کی حالات زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے سب سے آخر میں تاریخ خاتمہ دیوان ہے۔

منیر کے مندرجہ بالا تینوں دیوان کلیات کی شکل میں پہلی مرتبہ ثمر ہند پریس واقع محلہ کالکا بازار میں ماہ جمادی الثانی ۱۲۹۶ھ مطابق جون ۱۸۷۹ء میں منیجر مطبع اودھ اخبار کے اہتمام سے لکھنؤ میں منیر کی زندگی میں شائع ہوئے اس کلیات کی طباعت کے متعلق منیر خود کہتے ہیں۔

ہونٹھ ان کے دم گریہ جو کمتر نظر آئے    یاقوت کی عینک لئے لخت جگر آئے
دیوان مرے لکھنؤ میں چھپتے ہیں صد شکر    ہیں دید کے مشتاق منیر اپنے پرائے

مختصراً یہ کہ منیر کے تین دیوان گویا تین خم خانے ہیں۔ جن میں زیادہ تر قدیم شراب قرینہ سے مختلف شیشوں میں بھر کر رکھ دی گئی ہے۔ ہر دیوان اپنی اہمیت اور رنگا رنگی کے لحاظ سے آپ اپنی مثال ہے اور اپنے زمانے کی معاشرت اور علمی و ادبی رجحانات کا آئینہ دار ہے۔

پہلے دیوان کی غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شاعری لکھنؤ کے طرز سخن سے غیر معمولی طور پر متاثر ہے۔ خصوصاً غزلوں میں انھوں نے لکھنؤ اسکول کے

مایۂ ناز شاعر ناسخ اور رشک کی پوری تقلید کی ہے۔ ان کے دیوان میں سَو
اور سَو سے زیادہ اشعار تک کی غزلیں ملتی ہیں۔ ایک آدھ غزل میں اشعار کی
کی تعداد تو ڈیڑھ سو اشعار تک پہونچ گئی ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ بیشتر اشعار
میں نئے انداز نئے پہلو سے قافیوں کا استعمال ملتا ہے۔ مضامین کے اعتبار
سے نئے نئے مفہوم اشعار میں پائے جاتے ہیں۔ دیوان اوّل اور دوم کے کلام
میں طرز بیان کے اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے۔ (جیسا کہ انھوں نے خود فارسی
دیباچہ میں لکھا ہے) کہ دیوان اوّل کی اکثر غزلوں میں استعارات و کنایات
سے بیشتر کام لیا ہے اور دیوان دوم میں سادگی و سلاست کے معیار کو زیادہ
پیش نظر رکھا ہے۔ مگر پھر بھی اس بات کا خیال رکھا ہے کہ کسی موقع پر بھی
ان کی شاعری نزاکتِ معنی سے بیگانہ نہ رہے۔ دیوان دوم کے طرزِ کلام کی
اس امتیازی خصوصیت اور طرز بیان میں استعارات ایہامات کو ترک کرنے
کا سبب منیر نے یہ بتایا ہے کہ عہدِ حاضر کے شعرا نہ عروض و قافیہ سے واقفیت
رکھیں اور نہ انشا پردازی کے اصول جانیں پھر بھلا شاعرانہ خوبیوں کی کیا
گنجائش ہو سکتی ہے۔ یہ ان شعرا کا حال ہے جو صاحبِ دیوان بھی ہیں اور استاد
بھی مانے جاتے ہیں۔

کثیر تعداد میں ان کے شاگرد موجود ہیں۔ لیکن بے سوادی کے باوجود
محض مشقِ سخن کی بدولت اپنے آپ کو سخن رس و شاعر بے مثال سمجھتے ہیں۔
علاوہ ازیں سامعین کا یہ عالم ہے کہ ان کے سہل و آسان اشعار کا سمجھنا بھی دشوار
پھر فنی خوبیوں اور شاعرانہ لطافتوں کو وہ کیا سمجھ سکیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بے سواد
و کم علم شعرا کا کلام ان کی فہم کے مطابق ہونے کی وجہ سے ان کی نظر میں
قابل وقعت و احترام قرار پاتا ہے اور اہلِ معانی کی دقتِ نگاہ ان کیلئے بے معنی

اور مستحق تنقیص و تذلیل ہو جاتی ہے اور ان کی مقبولیت عوام بعض اوقات مقبولیت خواص کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن ان حالات میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو اس قسم کی سستی شہرت اور سطحی علمیت سے متاثر ہوئے بغیر علم و فضل کے قدر داں ہیں۔ اور ان کی نگاہ کھوٹے اور کھرے کے پرکھنے میں غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل ہے۔

میر نے فارسی دیباچہ میں لکھا ہے کہ مندرجہ بالا صورت حال کے ماتحت انھوں نے اوج مضامین بلند سے اتر کر دیوان دوم میں عوامی سطح پر بات کرنے اور شعر کہنے کی کوشش کی تاکہ عام طور پر ہر طرف پھیلے ہوئے معیار سخن پر اپنے کلام کو ہر دل عزیز اور قابل قدر بنا سکیں اور نافہم و کم سواد سامعین و قارئین کو مختلف و معاندانہ نکتہ چینیوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ میر کے الفاظ جو انھوں نے فارسی میں لکھے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

"بہر حال حالیا دو جلد دیوان از مہملات من زیب تالیف یافتہ و ایں دیوان اولیں ست کہ اکثر غزلیاتش بطرز استعمالات و کنایات بقالب نظم در آمدہ الا شعر دو دیوان دومی از آن طرز بر کرانہ و معہذا از نزاکت معنی بیگانہ نیست در ہر چند چاؤش نازک مزاجی بعض سخنوران نہیب دور باش میدہد کہ حرفی ترتم مگر درد دل انگشت بر لب میزند ؎

نالہ را ہر چند میخواہم کہ پنہاں بر کشم
دل ہمی گوید کہ من تنگ آمدم فریاد کن

پس مستفسر متاد کہ باعث ترک طریقہ استعارات و ایہامات جز ایں نیست کہ اکثر ابنائے زماں مایا الخصوص شعرا بیشتر از حلیہ علم و فضل عاری ہستند

بعد یکه تحریر خطوط مرسوم هم از قوت نشان براحل بعید عروض و قافیه
را اسم بی مسمی دانند تا بدیگر نکات چه رسد معهذا صاحب دیوان
و استاد جمع کثیر از شاگردان اند و بعض که چند مثلثات رسمیه در
طفولیت خوانده اند لاف و بالاخوانی معلومات خود بو فراس را از
طفل نیسه او اکثر دانند و محض به بت مشق کوس لمن الملک نواز
نده و مستعان شریک غالب این حضرات درین زمان اند چه استعداد
علمی و قوت فهم اشعار سهل هم ندارند تا به دیگر دقایق این فن چه رسد ناچار
اشعار ایشان را موافق فهم خود یافته بمدح انتها و ذم اهل معانی نغمه زنج
می سرایند و با اینهمه باوجود این هر دو طایفه از عصر هزار قوم
بیش لهذا بیاد و یا شهسوار و خار یا گلزار دعوی مساهمت بل افضلیت
می نمایند و ارباب معرفت و تحقیق بعضے بپاس ظاهری و بعضی به نظر
غلغله شاعری آنها فائز ترجیح بلا مرجح و تفضیل المفضول علی الفاضل
و تقدیم المفعول علی الفاعل مطلقا شده اند تا آنکه چند از اساتذه
متقدمین دام ظلهم و جمعی کثیر از عمائد مستمعین که فی الحقیقت
خلعت استادی و نقادی بر بالائے ایشان راست آمده از
دست این حضرات صد هزار نشتر بجگر شکسته و زبان سخن سرا بسته
کاغذ بد دیدند و ظلم کشیدند چنانچه محقق این فن مغفور و میرزا نواب
علی قلی خان متخلص بواله داغستانی عباسی شمخال در تذکرة الشعرا
که کتابے است مبسوط در تحت ترجمه میر نجات مرحوم اصفهانی
صاحب گل کشتی مولانا وحشی این دعوی را مدلل بدلائل قاطعه
و براهین ساطعه گردانیده نمن شاء فلیرجع الله نظر باین وجوهات شهباز

طبیعت را از اوج مضامین بلند فرود آوردند ہمراہ طیور طبائع این حضرات سر سید ند تا بجا برند زہر آنکہ پاس این جم غفیر و مراعات عام البلویٰ بنظر الاہم فالاہم اولیٰ نمود چہ این جماعت ہرگاہ شعری زیادہ از فہم و ادراک خود شنوند از غایت تعصب و نفاق منشی ناگاہ بفقدان استعداد خود ہا نا کردہ آنرا بے معنی قرار دہند و مصنف را آماج سہام ملام سازند و از اجلائے بدیہیات است کہ اینہا استعداد علمی را نقیض شاعری قرار دادہ اند پس رعایت خاطر عالیہ اساتذہ محقق و سخن شناسان مدقق کہ در نہایت قلت و چون اکسیر در لباس گرد کدورت محققی اند امحل محالات دانستہ تشمیر ذیل بعزم صاف گوئی کردم و فی الجملہ المنا بیکہ در فنیاب رفت از درد جگر بود کہ بیخود رست دل بزبان رسید دگرنہ بقول مولانا غالب دہلوی ؎

منکہ دعزم داورے کردن ساز بزم سخن وری کردن"

(کلیات منیر صفحہ ۶ تا ۸ حاشیہ)

منیر کی یہ صاف گوئی اور بے باکانہ تنقید بذات خود ان کے کردار، انداز بیان اور طرز کلام پر ایک حقیقت پسندانہ تبصرہ ہے اور منیر کی صاف باطنی بے ریائی اور نیک نفسی کو ظاہر کرتی ہے۔

تیسرے دیوان کا رنگ دونوں دیوانوں سے کچھ مختلف ہے کیوں کہ *نڈ مان سے وابستہ روایت پرستی، معنی آفرینی اور معاملہ بندی وغیرہ اس قسم کی سب خصوصیات ضرور تھیں مگر جذبات نگاری میں عریاں بیانی اور ابتذال نہ تھا۔ بقول عبادت بریلوی:-

"بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ رامپور کے درباری ماحول میں غزل کی روایت برقرار رہی کیونکہ عام طور پر درباری ماحول غزل کی روایت کا دشمن ہے لکھنؤ کے درباری ماحول نے اس سے قبل ایسا ہی کیا۔ لیکن رامپور کا درباری ماحول لکھنؤ کے درباری ماحول سے مختلف تھا یہاں کے عام ماحول میں وہ کیفیت کبھی بھی پیدا نہیں ہوئی جو لکھنؤ میں عام تھی۔ یہاں تعیش ہی سب کچھ نہیں تھا۔ لذت پرستی ہی سب کچھ نہیں تھی۔ زندگی کے دوسرے اقدار کا پاس و لحاظ بھی تھا خصوصاً مذہبی خصوصیات کے ساتھ اس ماحول کو عزیز تھیں[۴۴]۔"

رامپور کے رنگ سخن کا انداز یہ ہے کہ لکھنؤ اسکول سے جو بے جا لفاظی اور تصنع کا عنصر داخل شاعری ہو گیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اس کے ساتھ لفظی تحقیق کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایسے الفاظ اور ترکیبیں جو قدماء کی یادگار اور اہل دلی کے لئے مایۂ ناز تھیں۔ رخصت ہو گئیں۔ اب لوگ شاعری کے صحیح جذبات اور ان کے مناسب الفاظ سے واقف ہو گئے۔ شعرائے لکھنؤ نے سمجھ لیا کہ اس جدید رنگ کے سامنے ان کا اپنا رنگ جمنا محال ہے۔ مجبوراً وہی طرز اپنانا پڑا۔ جس کی وجہ سے داغ کی مقبولیت عام ہو رہی تھی۔ چنانچہ امیرؔ، جلالؔ اور منیرؔ نے دونوں اسکولوں کو ملا کر ایک نیا رنگ شاعری پیش کیا۔ جو ہر اعتبار سے قابل تعریف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ منیر کے دیوان کی غزلیات میں بلند خیالی، عمدہ تخیل اور سلاست و سادگی ملتی ہے۔

منیرؔ اس خیال کے قائل تھے کہ زمانے کے ماحول کے لحاظ سے شعر و سخن کے خصوصیات میں تبدیلی کرنے کی کسی حد تک ضرورت ہے۔ چنانچہ انکے

---

[۴۴] غزل اور مطالعہ غزل۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ صفحہ ۴۴

دیوان سوم کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں نہ صرف لکھنؤ اسکول قابل قدر رہ گیا تھا بلکہ زمانے کی رفتار اور زندگی کے مختلف حالات اور تقاضوں کی موافقت میں رنگِ سخن میں تبدیلی کرنے کی ضرورت تھی۔ منیرؔ کا کچھ کلام امیرؔ، داغؔ اور جلالؔ کے رنگ میں ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں بہت کچھ تبدیلیاں کیں۔ مثلاً دیوان اول اور دیوان دوم میں زنانہ لباس، کنگھی چوٹی کی تفصیلات اور نسائیت، کے چرچے بہت زیادہ ملتے ہیں۔ مگر دیوان سوم میں کسی حد تک ان چیزوں میں کمی آجاتی ہے جو غزلیں پندرہ عشقیہ اشعار اور پانچ اخلاقی یا تصوف کے مضامین پر مشتمل ہوتی تھیں وہ اب پانچ عشقیہ اور پندرہ غیر عشقیہ اشعار پر مشتمل ہونے لگیں۔

منیرؔ کے دواوین میں لاکھوں کی تعداد میں اشعار ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سب ہیرے موتی نہیں ہوسکتے ہیں۔ کچھ معمولی اور کمزور اشعار بھی ہیں جن کی بنا پر ان کا شمار بڑے بڑے شعرا میں نہ کرنا ناانصافی ہے۔ کلیات منیرؔ یا دواوین منیرؔ ایک دنیائے نظم ہے اور منیرؔ کی طبیعت نظم نگاری کی ایک مشین ہے۔ ہر صنعتِ سخن میں کلام موجود ہے۔ کہیں بھی عجزِ طبیعت کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بحرِ زخار موجیں مارتا ہوا چلا آرہا ہے۔ قصائد کی فراوانی ایک طرف، قطعات تاریخی کی کثرت دوسری جانب مخمسات کا یہ حال ہے کہ اپنے اساتذہ کی متعدد غزلوں کے علاوہ اپنے شاگردوں کی غزلوں پر بھی مصرعے لگائے ہیں۔ ان سب پر غزلوں کی کثرت اور ان میں کثرتِ اشعار ان کی قادر الکلامی اور پرگوئی کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

<u>منیرؔ بہ حیثیت نثر نگار</u>: نظم کے علاوہ منیرؔ نے نثر میں بھی طبع آزمائی کی ہو

مختلف عنوانات میں نثریں ملتی ہیں۔ دو کتابیں بھی نثر میں موجود ہیں۔ ایک تنقیدی اور دوسری داستان کی (جن پر الگ تبصرہ ہوگا)

نثر کے دیگر مضامین جو دیوان میں شامل ہیں۔ ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اردو نثر اس زمانے کے اکثر نثاروں سے بہتر ہے۔ تکلف و تصنع کے ساتھ بات کہنا اور جا بجا نثر کو مقفیٰ اور مسجع لکھنا اس زمانے کا رواج تھا۔ علاوہ ازیں ایک یہ بھی دستور تھا کہ عربی کے ثقیل اور نامانوس الفاظ عبارت میں استعمال کیے جاتے تھے۔ جس کا مقصد تبحر علمی کا اظہار ہوتا تھا۔ میر کی نثر میں بھی اس قسم کے رجحانات ملتے ہیں لیکن بالعموم انھوں نے نامانوس الفاظ سے پرہیز کیا۔ بات کو اس انداز پر کہا ہے کہ خواص و عوام سب اس کو بآسانی سمجھ سکیں اور انداز بیان کی لطافت اور بانک پن بھی قائم رہے۔ بطور نمونہ ان کی نثر کے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

الہ آباد کی کیچڑ کی شکایت میں لکھتے ہیں:

تیرہ بختی نے یہاں برسات میں بیداد کی
نیل خر کا میل ہے کیچڑ الہ آباد کی

اگرچہ ان دنوں ہر گلی کوچہ یہاں کا پاؤں پڑ کے سبب اختلاط کرتا ہے لیکن بعض محلوں کی زمین نے جیسے داؤد خاں کی سرائے شاہ گنج، نور گنج، دوندی پوری وغیرہ ہیں، تمام دنیا کی کیچڑ کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ چلنے پھرنے کا تو کیا ذکر ہے دیکھیے تو پائے نظر پھسلا پڑتا ہے۔ سنیے تو کان کا میل بڑھ کر گوش فیل ابر کیچڑتا ہے لاٹھی کا ہونا اگرچہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہے مگر پائے چوبیں کا زور کب تک چلے بلکہ بہرام چوبینہ کا نیزہ اس جگہ مورچہ ضعیف کا

خلال ہے۔ دیواروں کے پاؤں خود اکھڑے ہیں وہ کس کی دستگیری کر سکتی ہیں وہی شل ہے ؎

ایک قطرے کی بھی شبنم کے اگر آمد سنی
پاؤں دیواروں کے اٹھے پیشوائی کے لئے

کیا بُرا وقت ہے کہ پاؤں کے نیچے کی زمین نکل جاتی ہے۔ آٹھ مہینے وہ خاک اُڑتی ہے کہ لوگ خاکی وردیاں پہنے پھرتے ہیں۔ اس چار مہینے کی کیچڑ کی بدولت چھینٹوں کا لباس مفت حاصل ہے۔ اور یہ چھینٹ بھی وہ پختہ مزاج کی کہ ہزار شوب تک رفاقت نہیں چھوڑتی کپڑا پھٹ جائے داغ نہ جائے ٹھوکریں کھانے کو اور ایسی پوشاک پہننے کو واہ رے غریب پرور شہر کوئی ننگا بھوکا نہیں ہے۔"

اسی طرح پوری عبارت لکھی ہے جس کو پڑھ کر ان کے طرز تحریر پر روشنی پڑتی ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:۔

" ابر جو برابر برستا ہے، راہ چلنے والا گھر جانے کو ترستا ہے۔ ہر چند کیچڑ راہ دینے والی نہیں لیکن اس کا برسنا دو باتوں سے خالی نہیں یا تو دلدل میں پھنسے ہوؤں کی کیچڑ دھوتا ہے یا میونسپلٹی کی جان کو روتا ہے۔ جب یہ مٹی جوتے سے لپٹ جاتی ہے تو گوشت بنکر پوست میں ڈٹ جاتی ہے (رباعی)

یہ گوشت ہے عین پوست اے اہل جہاں
پھر پوست کو گوشت چھوڑ کر جائے کہاں
جوتے میں لگی ہے سیکڑوں من مٹی
مردوں کا بھی پاؤں بھاری ہوتا ہے یہاں

اگر حضرت آتش لکھنوی اس کیچڑ کا رنگ پاتے تو یہ مطلع کبھی نہ فرماتے

نہ چھوٹے گا چھڑا کر اس کو اپنے قاتل نہ بن لڑکا
وفاداروں کے خون کا داغ کیا دھبہ ہے کیچڑ کا

آجکل جو کسی کی ملاقات کو جاتا ہے۔ اگر ایک چھینٹا پڑ گیا تو کیچڑ کے ڈر سے پھر نہیں آتا ہے۔ صاحب خانہ کی چھاتی کا پتھر ہوتا ہے۔ میزبان اس کی جان کو۔ وہ کیچڑ پانی کو روتا ہے۔ اشارہ کنایہ میں خدا حافظ کا اظہار ہوتا ہے۔ مرزا سودا علیہ الرحمۃ کی اس بیت کا معاملہ روبکار ہوتا ہے ؎

جوں لگی ہوئے قطرہ اشتاقی
لار کھی اس کے آگے بادانی"

آخر میں لکھتے ہیں:-

"زیادہ خوف طول مقال ہے اور سامنے وناظر کی نزاکت طبع کا خیال ہے۔ شبدیز خامہ کیچڑ میں چلتے چلتے تنگ ہے اور پائے گفتار کوچۂ متعفن تفریح میں ٹھوکریں کھاتے لنگ ہو دائیں کیچڑ کی آب و ہوا سے سڑتی ہیں۔ دامن پاکیزہ اوراق پر نقطوں کی چھینٹیں پڑتی ہیں۔ کیچڑ سے ہر کوچہ خرابہ بلکہ گلابہ ہے کہنے کو الہ آباد آبہ ہے"۔ فقط (تاریخ یکم اگست ۱۸۷۰ء ۲ رجمادی الاول ۱۲۸۷ھ اخبار نور الابصار میں مطبوع ہوئی) [ش]

(۲) "دانش مند جانتے ہیں۔ اہل انصاف مانتے ہیں کہ دنیا میں ہندوستان جنت نشان ہے اور یہاں کے رہین کے لئے وہ شہر

---

ش (یہ نثر دیوان سوم بنام نظم منیر میں شامل ہے۔

وسیع آسمان ہے۔ حضور پرنور اس آسمان کے آفتاب ہیں۔ ذرہ نوازی میں لاجواب ہیں۔ اس شہر فیض بہر کے کنارے پر جوئے نورانی جاری ہے۔ گویا شاہد زریں قبا کے دامن میں کناری ہے۔ اس نہر کے پانی کی رنگت عکس فلک سے کیسی پیاری ہے کہ کتاب قدرت کے حاشیہ پر جدول زرنگاری ہے وہ دامن حضور کے فیض سے مالامال ہے اور اس کتاب کا پہلا باب در دولت و اقبال ہے۔ ان کا خوشا حال جو سایۂ دامن دولت میں سدا بہار سنبل و ریحاں پہ ناز کرتے ہیں اور ظل ہما کو گلیم کہنہ جان کر احتراز کرتے ہیں۔ دربار سلطانی ہمیشہ سے مجمع ارباب فضل و کمال ہے اور انشاء اللہ جاوید رہے گا۔ در دولت مرجع وسطات نوافل امانی و آمال ہے اور مدام کعبہ امید رہے گا۔ قدر دانی اور گوہر افشانی نے اسی دربار میں جنم لیا ہے۔ دوسری جگہ جائیں کیا مجال۔ دولت و اقبال نے خط غلامی لکھ دیا ہے۔ نافرمانی و سرتابی محال۔ زمانہ شیرۂ فیض کرم سے اس قدر معمور ہے کہ تذکرہ ہمت حاتم کی گنجائش نہیں۔"

آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

"الٰہی آفتاب عمر و دولت زاید النور و در مدام ضیا بار و بیت السرور و مصداق بلدہ طیبہ در بہار و غفور رہے۔

ایک نثر "در شکایت انکم ٹیکس" کی کچھ عبارت بطور نمونہ درج ہے۔

"ہر چند اس کی تحقیق علماء امداد خصوصاً متکلمین دلی و قتار نے قرار واقعی کی ہے مگر راقم اخبار کا مقصود [illegible]

نظر جو اپنے ملاحظہ سے اس بے ہودہ نگاری کو شرف فرماتے
ہیں اور پائے نگاہ کو زحمت کوچہ گردی بین السطور دیتے ہیں
اس سے مطلع ہو جائیں گے۔

آخر میں تحریر فرماتے ہیں:-

"سچ ہے کہ دوہری نعمتیں کم کم ملتی ہیں بقول بندہ ؎

ایک باری نہیں ملتے کبھی دو دو مطلب
باغ کا قاعدہ ہے جھول گئے پھل آئے

اب پھر اصلی حال لکھتا ہوں نہ تو انکم ٹیکس تکلیف مالا یطاق ہے
اور نہ زاری نالی اہل ہند بیجا پھر کیا ہے ظاہر الامر بین الامرین
کہا چاہیئے یا جو کچھ ارباب فکر و نظر تجویز کریں۔" فقط ؎

نثر میں "ہندوستان کی تعریف میں" "کیچڑ کی شکایت" اور انکم ٹیکس کی
شکایت وغیرہ کے علاوہ تیسرے دیوان میں کچھ فارسی خطوط بھی درج
ہیں۔ فارسی خطوط جو انھوں نے اپنے دوستوں کے نام لکھے ہیں انمیں
وہ جوابات دئے گئے ہیں جو ان کے دوستوں نے ان سے شاعری یا زبان
وغیرہ پر صلاح و مشورہ کے لئے لکھے تھے مثلاً علی ضامن صاحب شوق،
آغا سید حسین مرزا صاحب شوق۔ ولی حیدر صاحب فرخ آبادی وغیرہ وغیرہ
کے جوابات فارسی میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ خطوط بھی شامل
ہیں جو کہ انڈمان سے نواب رامپور کو لکھے گئے ہیں:-

خطوط چونکہ انسان کی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں، اس لئے اس سے
اخذ کئے ہوئے نتائج سب سے زیادہ صحیح ہوتے ہیں۔ انسان کو خط لکھتے

---

؎ دیوان کمیاب ہونے کی وجہ سے زیادہ عبارت درج کی گئی ہے۔

اس لیے اخذ کئے ہوئے نتائج سب سے زیادہ صحیح ہوتے ہیں۔ انسان کو خط لکھتے وقت کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس کے خط چھپ بھی سکتے ہیں اس لئے وہ بے باک ہوکر خط میں صحیح جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ چنانچہ منیر کے خطوط میں دلی تاثرات کا بیان ملتا ہے۔ تعزیت پر بھی حکیم محمد حسن خاں صاحب کو لکھا ہے۔ کسی کسی خط میں انھوں نے خاص واقعہ کا حال بھی لکھا ہے جس سے ان کی سوانح حیات لکھنے میں حوالہ و ثبوت مل گیا ہے یعنی منیر کے خطوط نے ان کی زندگی کے حالات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

نثر اور خطوط میں بھی منیر نے اختصار سے کام نہیں لیا ہے۔ ہر چیز کو طول طویل طریقہ سے پیش کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ منیر ایک بلند مرتبہ شاعر ہوتے ہوئے نثر کے میدان میں بھی اپنے ہم عصر نثاروں سے پیچھے نہیں رہے۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی فوقیت حاصل ہو اردو نثر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بیان مقفی و مسجع عبارت ہے رعایت لفظی کا بھی استعمال ہے مگر حسن ادا لاجواب ہے۔

## منیر کے شاگرد

منیر کے شاگرد کافی پائے جاتے ہیں۔ جن کے نام حسب ذیل ہیں:-

۱۔ مرزا عاشق حسین اکبرآبادی بزم۔ صاحب دیوان
۲۔ محی الدین حسین تسنیم مدراسی۔ صاحب دیوان
۳۔ اصغر علی ثابت
۴۔ عبدالغنی جاوید
۵۔ آغا علی نقی خاں جمیل
۶۔ قاسم علی خاں حافظ

۷۔ محمد حسن مچھلی شہری

۸۔ سید برہان الدین حیدر خاں نیشاپوری

۹۔ اسمٰعیل شاہ خاں سالک بریلی نعت گوئی

۱۰۔ نصیر احمد خاں سحاب حیدر رامپوری

۱۱۔ دلدار حسین شباب

۱۲۔ سید صادق شاہ صادق

۱۳۔ محمد ارشد علی جنیا بدایونی

۱۴۔ شیخ شمس الدین طلوع

۱۵۔ آغا علی نقی عشق۔ لکھنوی

۱۶۔ محمد حسین قمر رامپوری

۱۷۔ لالہ بلاس رائے قیاس۔ صاحب دیوان۔

۱۸۔ جعفر علی بیگ دلا لکھنوی۔

۱۹۔ سید محمد نوح شہیر مچھلی شہری

۲۰ مرزا امیر بیگ ہنر

۲۱۔ لالہ مادھو رام جوہر فرخ آبادی۔ صاحب دیوان

۲۲۔ نواب اصغر حسین خاں ناخر لکھنوی۔ صاحب دیوان

۲۳ طالب علی خاں طالب آنولہ۔ صاحب دیوان

۲۴۔ نواب علی بہادر علی باندہ۔ صاحب دیوان

۲۵۔ فرزند حیدر صفدر فتح آبادی۔ صاحب دیوان

۲۶۔ شیخ محمد [illegible]

۲۷۔ پنڈت سندر لال [illegible]

۲۸۔ محو۔ فرخ آبادی۔
۲۹۔ اختر۔ فرخ آبادی۔
۳۰۔ تاثیر فرخ آبادی
۳۱۔ پنڈت جودت فرخ آبادی
۳۲۔ مولوی محمد ناصر صاحب الہام
۳۳۔ نواب واجد علی خاں مرحوم رضواں
۳۴۔ سید علی عباد نیساں
۳۵۔ نواب رضواں

سب شاگردوں کے حالات باوجود کوشش و تلاش دستیاب نہیں ہو سکے۔ صرف چند کے متعلق کچھ معلومات فراہم ہو سکی ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ لالہ مادھو رام جوہر فرخ آبادی کامل شاعر، استاد حق شناس اور صاحب جوہر تھے۔ اپنے تمام شاگردوں میں منیر ان سے زیادہ متاثر تھے۔ جب ان کے فرزند پیدا ہوا تو منیر نے حسب ذیل قطعہ تاریخ کہی۔

لالہ مادھو رام جوہر شاعر شیریں بیاں گوہر دریائے ہمت ماہ والا جاہ بزم
شاد ہیں پیدائش نور نظر سے اس قدر سرمۂ چشم تحیر ہے غبار راہ بزم
خوب ہے یہ مصرع سال ولادت اے منیر جوہر آئینہ اقبال حشمت ماہ بزم

۱۲۷۳ھ

محمد حسین قمر امیوری تحصیلدار ریاست بھرت پور تھے۔ ان کو سراج الشعرا مرزا عاشق حسین بزم اکبر آبادی کی بہن منسوب تھیں۔ منیر کو ان سے دلی عقیدت تھی۔ علی عباد نیساں سے منیر کو دلی محبت تھی۔ برابر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ نیساں الہ آباد میں تحصیلدار تھے۔ شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔

تحقیق و تدقیق، تکلف و تصنع اور علمی مشاغل کا نتیجہ یہ ہوا کہ سعادت حسن خاں برہان الملک کے زمانہ سے غازی الدین حیدر کے زمانہ تک زبان اپنی کیفیت و لطافت۔ وسعت و مقبولیت۔ لب و لہجہ و ترکیب الفاظ کے لحاظ سے کچھ کی کچھ ہو گئی۔

لکھنؤ کے زبان شاعری کی مخصوص روایات قائم کرنے اور انکو آگے بڑھانے میں قاضی محمد صادق اختر اور میر جعفر علی حسرت کا بہت ہاتھ تھا۔ یہ لوگ اہل لکھنؤ کو میدان ادب میں دوسرے شہسواران ادب سے ممتاز اور بہت آگے رکھنا چاہتے تھے۔ اور سیاسی آزادی و انقلابی کوششوں کو تصنیف و تالیف، تقریر و تحریر میں بھی برقرار رکھنے کے خواہش مند تھے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں قاضی محمد صادق اختر کی شاہی دربار میں کافی رسائی تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ان کی مثنوی سراپا سوز کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

> "قاضی محمد صادق اختر شروع انیسویں صدی میں لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں سے تھے۔ بلکہ ایک تذکرہ نویس نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ غازی الدین حیدر بادشاہ (۱۸۱۴ء۔ ۱۸۲۷ء) نے انہیں ملک الشعراء کا خطاب [۵] دیا تھا۔"

منیر شکوہ آبادی کو چونکہ لکھنؤ کے اساتذہ اور معاشرت سے تقریباً بچپن ہی سے واسطہ رہا۔ اور انھوں نے اپنی شاعری اور زندگی ہی میں دبستان لکھنؤ کی روایات کا احترام ہر قدم پر ملحوظ خاطر رکھا۔ لہذا مختصراً کچھ اس پس منظر

---

[۵] مثنوی سراپا سوز۔ محمد صادق اختر۔ مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صفحہ ۵ (ناشر مکتبہ کلیاں ۱۹۶۱ء)

کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ جس نے لکھنؤ کی زندگی اور شاعری کو یہ آب و رنگ دیا اور جس کی ترجمانی ہم کو منیر کے کلام میں ہر طرف نظر آتی ہے ۔

جب سعادت خاں برہان الملک نے انتظام سلطنت سنبھالا تو ہر طرف ان کی مقبولیت روز افزوں ہونے لگی۔ انھوں نے عوام کو لوٹ مار کرنے والے چوروں اور ڈاکوؤں سے بچانے کے لئے چوکیاں بنوائیں۔ اور خود بہ نفس نفیس ان انتظامات کی دیکھ بھال کرنے کی زحمت اُٹھائی جو رعایا کی جان و مال کی حفاظت کے لئے وہ کر رہے تھے۔ انھوں نے مختلف مقامات کے دورے کئے اور ایسا اچھا انتظام کیا کہ ملک سے لوٹ مار اور غارتگری بالکل ختم ہو گئی ۔

شجاع الدولہ (۱۷۵۳ء تا ۱۷۷۵ء) نے بھی باقاعدہ نظام سلطنت کی بہتری کی طرف توجہ کی۔ ذاتی دیکھ بھال کا نتیجہ یہ ہوا کہ خزانے دولت سے بھر گئے اور ملک کی خوش حالی کے چرچے پاس پڑوس کے علاقوں میں ہونے لگے۔ اہل ملک میں ہر طرف خوش باشی اور فراغ دستی عام ہو گئی۔ اور اودھ کی فارغ البالی اور نفاست پسندی ضرب المثل بن گئی ۔

وہ زمانہ ایسا تھا جبکہ مغلیہ حکومت زوال پذیر تھی۔ سیاسی آزادی ختم ہو چکی تھی۔ وضعداری کے لحاظ سے جو شعراء اور اہل کمال دہلی کی خاک پاک پر جان دیتے تھے اور جنھیں اپنی رفتار و گفتار، اطوار و کردار پر ناز تھا۔ وہ بھی اب دلی کے حالات اور ماحول سے تنگ آ گئے تھے۔ رفتہ رفتہ دلی کے حالات اہل کمال کے لئے ناقابل برداشت ہوتے جا رہے تھے ۔ اور متاع ہنر کے مالک دلی کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سیاسی بدحالی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور اہل دولت و اقتدار طاقت و لشکر کے مالک بن جاتے

تھے۔ دہلی کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہو رہی تھیں۔ مثلاً اودھ فرخ آباد، مرشد آباد، دکن، ارکاٹ، اور روہیلکھنڈ وغیرہ۔ ان سب میں اودھ کی حکومت ایک امتیازی شان رکھتی تھی اور ہر لحاظ سے مقبولیت عام حاصل کر رہی تھی۔ ارباب فضل و کمال نے اکثر و بیشتر اودھ کا رخ کیا۔ اور وہاں پہونچکر سرزمین لکھنؤ نے ان کو ایسا لبھایا کہ وہیں کے ہو رہے۔

لکھنؤ میں جب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء۔ ۱۷۹۷ء) کا عہد شروع ہوا۔ تو انھوں نے دل کھول کر شاہی خزانے کا روپیہ خرچ کیا۔ فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائیاں کیں۔ لکھنؤ کا مشہور امام باڑہ "آصفی" خشک سالی کے زمانہ میں تعمیر کرا کے نہ صرف نفلوک الحال شرفا کو روزی بخشی۔ بلکہ وہاں کی تہذیبی زندگی میں ایک اہم اضافہ کیا۔ کسان زمیندار جن پر ملک کی ترقی کا دار و مدار تھا خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور ہر شخص اپنی جگہ پر مطمئن تھا۔ اس وقت اودھ اپنی تہذیب اور معاشرت میں بہت سی ممتاز خصوصیات کا حامل تھا۔ مؤلف گل رعنا کا بیان ہے :-

"نواب آصف الدولہ کے زمانے کا یہ کارنامہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لہو و لعب میں مشغول ہونے کے ساتھ مذہب تشیع کی اشاعت میں انھوں نے دل سے کوشش کی۔ ان کے نائب حسن رضا خاں بھی مذہبی آدمی تھے وہ بھی اسی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ان کی کوشش سے ہزاروں خاندان سنی سے شیعہ ہو گئے۔ اور ان کو جاگیریں ملیں۔ جو اپنی ضد پر

قائم رہے ان کی جاگیریں جو شاہان مغلیہ کے زمانہ سے چلی آتی تھیں ضبط کر لی گئیں۔ شاہ علی اکبر چشتی مودودی کے مشورہ اور ملا محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے نواب رضا خاں نے جمعہ جماعت قائم کر کے سب سے پہلے مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی کی اقتدا میں ۲۱ رجب سنہ ۱۲۰۰ھ کو نماز ادا کی۔ یہ پہلا دن ہے کہ وسط ہند میں شیعوں نے اپنا جمعہ جماعت علیحدہ کر لیے ہیں[۱۵۱]

آصف الدولہ مذہبیت کے دلدادہ تھے لیکن چونکہ دولت کی افراط اور سکون کی ارزانی طبیعت کو ہمیشہ آرام طلبی اور عیش کوشی کی طرف مائل کر دیا کرتی ہے۔ چنانچہ بہو بیگم[۱۵۲] کے انتقال کے بعد فیض آباد بالکل سنسان ہو گیا۔ وہاں کی بچی کھچی آبادی سے بھی شعرا و ادیب اور دیگر فن کار لکھنؤ کو روانہ ہو گئے۔ چنانچہ لکھنؤ کا نقشہ بہ الفاظ مسیح الزماں صاحب ملاحظہ ہو:۔

" اطلس و کمخواب، عطر و گلاب، شاہد و شراب روزمرہ زندگی کے جزو بن گئے۔ آصف الدولہ کو خود عورتوں سے کوئی

---

۱۵۱ تذکرۂ شعرائے اردو موسوم بہ گل رعنا۔ مولوی حکیم سید عبدالحئی صاحب صفحہ ۱۵۲ (حاشیہ عبارت ہے)

۱۵۲ بہو بیگم:۔ ان کا اصل نام امۃ الزہرا بیگم تھا۔ وہ مؤتمن الدولہ نواب محمد اسحق خاں شوستری کی بیٹی تھیں۔ مگر محمد شاہ بادشاہ نے ان کو اپنی بیٹی بنا کر شجاع الدولہ کے ساتھ شادی کی تھی۔ سسرال سے ان کو "بہو بیگم" کا خطاب ملا تھا۔ فیض آباد کی رعایا ان سے بہت خوش تھی۔

دل چسپی نہ تھی لیکن امراء و رؤساء کا عیش ان کے بغیر مکمل کہاں ہو سکتا تھا۔ ناچنے گانے والیوں کے علاوہ خوب صورت عورتیں دور دور سے آکر لکھنؤ کی زینت بن گئیں ۔" [۵۸]

نواب شجاع الدولہ کے زمانے سے ہی فیض آباد کی حالت رُو بہ زوال تھی۔ اہل فضل و کمال کا جو سیلاب فیض آباد کی طرف جا رہا تھا۔ وہ لکھنؤ کی طرف اُمنڈ پڑا۔ پرانے شعرا تو دب کھپ گئے۔ البتہ نوجوان شعراء نے میدان خالی پاکر اپنا رنگ کھل کر کھیلا۔ اصلیت میں دلی کی شاعری اپنے دور آخر میں انشاء۔ رنگین اور جرأت کی بدولت جس طرف آرہی تھی۔ وہاں سے لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔ چونکہ بنیاد کج تھی اس لئے عمارت آخر تک کج ہی رہی۔ آصف الدولہ کے بعد سعادت خاں تخت نشین ہوئے۔ پھر غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء۔ ۱۸۲۷ء) کا زمانہ شروع ہوا۔ ان کے زمانے میں بھی شعر و ادب کی کافی ترقی ہوئی۔ انھیں کے عہد کے مشہور شاعر قاضی محمد صادق اختر نے لکھنؤ کے ادب کو ایسا معیار دیا کہ دوسرے ادبی مرکزوں سے یہاں کا ادبی معیار بلند ہو گیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جس کے لئے سحر نے کہا ہے ؎

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو
ہر اک گھر خانۂ شادی ہے ہر کوچہ ہے عشرت کا

مختصر یہ کہ دولت کی فراوانی اور فضائے تعیش نے خود مختاری اور آزادہ روی کی راہ دکھائی۔ تماش بینی اور تفریح بازی پر لوگ فخر کرنے لگے۔ نواب آصف الدولہ کا نام سخاوت کے سلسلے میں ضرب المثل ہے حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے دل کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ شاعروں اور ادیبوں کی کافی ہمت افزائی کی۔ بادشاہوں (آصف الدولہ کو چھوڑ کر) اور

---

امراء کو صنف نازک سے خاص دلچسپی تھی۔ آجکل کی طرح اس زمانہ میں سینما ہال، کافی ہاؤس، بال روم اور کلب وغیرہ نہ تھے۔ اس لئے خوش وقتی اور تفریح کا ذریعہ صرف طوائفیں اور حسین و جمیل عورتیں ہو سکتی تھیں اس لئے بے شمار ناچنے گانے والیاں شہر میں بسی ہوئی تھیں۔ جہاں رذیل و شریف سب ہی جاتے تھے اور ہنسی مذاق، رقص و موسیقی، شعر خوانی و نقرہ بازی میں دل بہلاتے تھے۔ بازاری عورتیں اور ان کے ساتھ گانے والے طائفے اس قدر تھے کہ کوئی محلہ اور کوئی کوچہ ایسا نہ تھا جہاں وہ موجود نہ ہوں۔ ان کی حالت مالی اعتبار سے بالعموم اچھی تھی۔ ان میں اکثر طوائفیں ڈیرے دار تھیں۔ امراء و روساء کے علاوہ درباری بھی آزادانہ طور پر اپنے مالکوں کی نقل کرتے تھے۔ ایک حمام تھا جس میں سب برہنہ تھے۔ یہی تمام اثرات شعر و شاعری میں بھی رونما ہوئے۔ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی :-

"ان رنگ رلیوں سے جو خرابیاں سوسائٹی میں پیدا ہو سکتی ہیں وہ سب لکھنؤ میں پیدا ہو گئیں۔ مثلاً نواب سعادت خاں برہان الملک کی سپاہیانہ زندگی کے برعکس شجاع الدولہ کو حسین و مہ جبین عورتوں کی صحبت پسند تھی۔ اور وہ اپنا زیادہ وقت انھیں کی صحبت میں گذارتے تھے بلکہ اکثر ڈیرے دار طوائفیں ان کی ملازم تھیں اور دورہ تک میں ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کے درباری اور امرا بھی اس شوق کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ شاعری جس میں بگڑنے کے آثار پیدا ہو چکے تھے ان کے اعمال ناموں کی سیاہی سے آلودہ ہو گئی۔ ایسی شاعری کا ایک خاص نام معاملہ بندی ہوا جس کے پردے میں بد اعمالی اپنی سیہ کاریوں کا اعلان کرنے لگی اس حالت

کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ارباب فضل و کمال کے ساتھ ساتھ دہلی کی پیشہ ور عورتیں فیض آباد اور لکھنؤ آ رہی تھیں"[1]

الغرض لکھنؤ سے سادگی رخصت ہو گئی۔ ظاہری تکلفات نے تہذیب کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا کہ سادگی اور بے تکلفی کو پھوہڑپن اور پستی مذاق کی نشانی سمجھا جانے لگا۔ رہن سہن کا ماحول بھی بدل گیا۔ امراء کا کیا ذکر متوسط طبقہ کے لوگ بھی گلاب سے نہاتے، پھولوں کی سیج سجا کر سوتے، سچے موتیوں کو پھونک کر ان کا چونا پان میں کھاتے تھے۔ روزانہ دعوتوں کا اہتمام بھی اسی طرح ہوتا جیسے آج کل بڑی دعوتوں میں ہوتا ہے۔ غرضکہ بہت پرتکلف زندگی تھی۔

نوابی حکومت کا سلسلہ چلتا رہا اور ساتھ ہی اودھ کا وہی ماحول رہا۔ مگر جب واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء۔ ۱۸۵۶ء) تخت نشین ہوئے تو عیش و عشرت اور ماحول میں رنگینی اور بھی بڑھ گئی۔ ان کے زمانے میں لکھنؤ عیش پسندی اور عشرت پرستی کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اہل لکھنؤ اپنے رنگین بادشاہ کے متوالے تھے۔ لکھنؤ میں آئے دن ایسے مشغلے رہتے تھے کہ ہر لب پر گل کا فسانہ تھا اور ہر زبان پر بلبل کا ترانہ تھا۔ ہر شب گانے بجانے کی دھوم تھی اور ہر طرف جھیلوں کے جمگھٹے لگے رہتے تھے۔ ہر گوشہ بقول غالب "دامانِ باغبان و کفِ گل فروش" بنا ہوا تھا۔ شعر و شاعری کے چرچے بڑھے اور بادشاہ کی قدردانی نے شعر و شاعری کا ہر خاص و عام میں بے حد ذوق و شوق پیدا کر دیا۔ آئے دن مشاعرے ہوتے تھے۔ شاعری کے فن کو چمکانے کے علاوہ دیگر فنون لطیفہ مثلاً موسیقی اور رقص کو بھی ترقی نصیب ہوئی۔ واجد علی خود بھی ان دونوں فنون کے ماہر تھے۔ اس کا اثر بھی شاعری پر پڑا۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے

---

[1] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صفحہ ۴۲ (طبع اول ۱۹۴۴ء)

واجد علی شاہ کے لئے لکھا ہے:-

"یہ اپنے زمانے میں موسیقی اور رقص کے سب سے بڑے سرپرست تھے۔ ٹھمری اور بھیرویں کی مقبولیت انھیں کی مرہون منت ہے ڈرامے ہوتے تھے۔ انھوں نے لکھنؤ میں خالص ہندوستانی اسٹیج کی بنیاد ڈالی۔ ولی عہدی کے وقت واجد علی شاہ کے لئے لکھا ہے:

"یہ اپنے زمانے میں موسیقی اور رقص کے سب سے بڑے سرپرست تھے۔ ٹھمری اور بھیرویں کی مقبولیت انھیں کی مرہون منت ہے؟ ڈرامے ہوتے تھے۔ انھوں نے لکھنؤ میں خالص ہندوستانی اسٹیج کی بنیاد ڈالی۔ ولی عہدی کے وقت واجد علی شاہ بیس برس کے نوجوان تھے۔ ناچ گانے کا شوق شباب پر تھا۔ اور روپے کی کمی نہ تھی۔ حسین اور خوش گلو طوائفیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کی گئیں۔ جو عورتیں ناچنے گانے کے فن میں کامل نہ تھیں۔ ان کی تعلیم بذریعہ استاد کی گئی۔ اچھے اچھے سازندے نوکر ہوئے۔ یہ طوائفیں پریاں اور ان کے استاد "بہار محفل" والے کہلاتے تھے۔"[۵۵]

اہل لکھنؤ کی معاشی فارغ البالی اور تعیش کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں مثلاً قیصر باغ[۵۶] کا مشہور میلا جس میں واجد علی شاہ کنہیا بنتے اور خوش شمائل

۵۵۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج صفحہ ۶۸، پہلی چھاپ ۱۹۵۷ء

۵۶۔ قیصر باغ کی بارہ دری واجد علی شاہ نے بنوائی تھی۔ جو اپنی خوبصورتی اور شان میں لاجواب تھی۔ اس میں بہت سی خوش نما اور فلک بوس دو منزلی عمارتیں (باقی صفحہ ۱۲۸ پر)

عورتیں گوپیاں بن کر ان کو ڈھونڈتی پھرتیں اور لکھنؤ کے رنگین مزاج لوگ جوق در جوق اس کو دیکھنے آتے تھے۔ اس فضا کی یادگار امانت کی اندر سبھا ہے۔ جو اردو ڈرامائی نظم و نثر کا پہلا نمونہ ہے۔ انھیں تمام لوازمات میں روپیہ لٹایا جاتا تھا۔ جس سے رفتہ رفتہ خزانہ خالی ہونے لگا تھا بلا کسی محنت مشقت کے بے شمار دولت بہ آسانی حاصل ہونے کی وجہ سے لوگ آرام پسند اور ترقی کی طرف سے لاپرواہ ہو گئے تھے۔ دوسرے شہروں سے آئے ہوئے لوگ بے تکلف شاہی خزانے سے فیض یاب ہوتے تھے۔ واجد علی شاہ نے خود لکھا ہے کہ:

"مجھ کو جلسے کے ترتیب دینے اور گانے والیوں کے جمع کرنے کا بہت خیال تھا۔ اس سبب سے سازندوں اور علم موسیقی کے کاملوں کی تلاش بہت تھی کہ پریوں کو تعلیم دیں اور ان کی مشق ترقی پذیر ہو"۔

بادشاہ کو صرف دو چیزوں سے دلچسپی تھی۔ ایک موسیقی دوسرے شاعری۔ دونوں فنون کی ترقی ہوئی۔ اور ماحول کے اثرات سے شاعری بھی ویسے ہی رنگ میں رنگ گئی۔ مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ لکھنؤ میں دولت کی

---

۵۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج سید مسعود حسن رضوی صفحہ ۲۰ (بحوالہ محل خانہ شاہی صفحہ ۴۷)

(بقیہ صفحہ ۱۲۷) کا ایک مربع مستطیل رقبہ دور تک چلا گیا تھا۔ اس سے ملحق کوٹھی خاص مقام تھی۔ جس میں خود جہاں پناہ سلامت رہتے تھے۔ قیصر باغ کی عمارت میں سلطنت کے اسی لاکھ روپیہ خرچ ہوئے تھے۔ اس کے چاروں طرف عمارتوں میں جہاں پناہ کی بیگمیں اور پری جمال و ماہ طلعت خاتونیں رہتی تھیں۔ سال میں ایک مرتبہ قیصر باغ میں ایک عظیم الشان میلہ ہوتا تھا جس میں عوام کو بھی قیصر باغ میں آنے اور جہاں پناہ کی عشرت پرستیوں کا رنگ دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ (لکھنؤ کی آخری شمع مرتبہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس پر مفصل روشنی ڈالی ہے)

مشاغل سے لاپروائی برتنا شروع کر دی تھی اور دوسری دلچسپیوں میں مصروف رہنے لگے تھے۔ اس زمانے میں جو شان و شوکت لکھنؤ میں تھی۔ ہندوستان بھر میں کہیں نظر نہ آتی تھی جیسا کہ خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:-

"واجد علی شاہ نے جب فوج از سر نو مرتب کر لے کے احکام نافذ کئے تو برطانوی ریزیڈنٹ نے بادشاہ سے دریافت کیا کہ حضور فوج کی تیاری میں اس قدر زحمت کیوں برداشت فرماتے ہیں اور یہ تجویز پیش کی کہ اگر حضور کی حفاظت کی خاطر افواج کی ضرورت ہو تو برطانوی افواج استعمال کی جا سکتی ہیں۔ جن کے اخراجات محاصل اودھ سے ادا کر دئے جائیں گے چونکہ فوجی جدو جہد کو ناپسند کیا گیا تو بادشاہ نے دوسرے مشاغل میں اپنے تئیں مشغول کیا۔ اس کے بعد سے انھوں نے امور سلطنت سے غفلت برتنی شروع کر دی اور عیش و عشرت میں بسر اوقات کرنے لگے"[۵۸]

غرضکہ آصف الدولہ کے عہد سے لے کر واجد علی شاہ کے عہد تک لکھنؤ کا یہ دور حسن و عشق اور رنگ و بو کا ایک دلکش نمونہ تھا۔ ہر طرف عیش و آرام تھا۔ غریب و امیر سب ہی زندگی کا پورا لطف اٹھا رہے تھے۔ اس زمانے کی مشہور عمارتیں مثلاً رومی دروازہ، دل کشا، دل آرام باغ۔ لال بارہ دری۔ لکھنؤ کی عیش پسندی کا ثبوت ہیں، لکھنؤ کی سرمستیاں شباب پر تھیں اور بجا طور پر یہ کہا جا سکتا تھا کہ:-

~ "چاندنی ہے سایۂ دیوار قہقہہ باغ میں"

---

[۵۸] رنگ صبح و شام۔ از خواجہ حسن نظامی صفحہ ۶۵

واجد علی شاہ کا دربار مشرقی تمدن کا آخری نمونہ تھا۔ اس دور میں علم اور علماء کی ضرب المثل سرپرستی رہی۔ اربابِ فنونِ لطیفہ اور اصحاب علوم شریفہ کی قدر دانی ہوئی۔ غرضکہ ہر اعتبار سے مشرقی تمدن کا یہ آخری دربار نو سال تک قائم رہا۔ ظاہر ہے کہ چہرے کی بڑھی ہوئی سرخی ہمیشہ تندرستی کی علامت نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی اس کے نتائج اچھے نہیں ہوتے۔ بعینہ یہی حال نوابی حکومت کا ہوا۔ مگر شعر و شاعری کی مقبولیت بتدریج میں اس کے نتائج اچھے ظاہر ہوئے۔ بیگموں نے بھی شاعری میں حصہ لیا۔ چنانچہ محل کی بیگموں نے زبان اور محاوروں کے لحاظ سے نظم کی کڑیوں میں موتی پروئے۔ بیگمیں سخن گوئی اور سخن فہمی دونوں میں ماہر تھیں۔ خاص طور سے مخدرہ عظمی نواب بادشاہ محل صاحبہ سب سے اول تھیں اس وقت کی شاعری کے بارے میں رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں :۔

"واجد علی شاہ خود بھی بہت اچھے شاعر تھے انھوں نے دربار میں ایسے نغز گو اور غزل سرا جمع کئے تھے جو اپنی مثال آپ تھے۔ جن کا رنگ سخن اپنے اندر انفرادیت کی خاص شان رکھتا تھا۔ جن کی شاعرانہ سیرت اور کردار میں بھی ایک خاص رنگ جھلکتا تھا۔ یہ وہ عہد تھا جس میں آتش و ناسخ کا ڈنکا بج رہا تھا اور میر انیس و مرزا دبیر جیسے یکتائے روزگار موجود تھے"[۱]

لکھنؤ دبستان شاعری کی خصوصیات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ سارے عناصر کا تعلق براہِ راست لکھنؤ کے تمدن اور وہاں کی معاشرت سے ہے۔ لکھنؤ کے ماحول اور وہاں کی فضا کا اثر لکھنؤ کی شاعری پر پڑا یہاں کی

---

[۱] واجد علی شاہ اور ان کا عہد۔ رئیس احمد جعفری۔ صفحہ ۲۵

تک کہ آتش جیسے صوفی بزرگ کے قلم سے اس طرح کے شعر نکلنے لگے۔

کسی کے محرم آب رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا

غرضکہ اس زمانے کا ماحول ہی ایسا تھا کہ جب تک غزل میں عیش و نشاط کے تذکرے اور وہ بھی نئے نئے انداز سے نہ کئے جائیں زندگی کی ترجمانی نہیں ہوتی تھی اور شاعر کو مقبولیت نہیں حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ منیر شکوہ آبادی بھی اس ماحول سے متاثر ہوئے اور انھوں نے وہ سب خصوصیات اپنانے کی کوشش کی کہ جو اس عہد میں مقبول عام تھیں۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حسب ذیل خصوصیات ان کے کلام کا نمایاں جز ہیں۔

۱۔ مذہبی رنگ

۲۔ معاملہ بندی اور خارجیت

۳۔ تشبیہات و استعارات

۴۔ پرگوئی اور نادرالکلامی

۵۔ زباں دانی اور شستہ بیانی

**مذہبی رنگ** منیر کی شاعری میں بھی مذہبی رنگ ملتا ہے۔ چنانچہ مثنوی معراج المضامین پوری مذہبی رنگ میں ہے اور کچھ قصیدے بھی مذہبی رنگ میں ہیں۔ اس کے علاوہ منیر کی غزلیات کے اکثر مقطعوں میں مذہبی رنگ ملتا ہے۔ جس کو ہم لکھنؤ میں چھائی ہوئی مذہبی فضا اور مرثیہ گوئی کے مروج اور مقبول ہونے کا ایک حد تک نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔ منیر نے مقطع میں مشکل کشا سے امداد کے طالب ہوتے ہیں۔ کہیں وہ شاہ نجف سے امداد کی درخواست

کرتے ہیں، کہیں امام سے مصائب سے نجات دلانے کی التجا کرتے ہیں اور حج و زیارت کی تمنا کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً:

کھنؤ سے تا نجف پڑھتے ہوئے جائیں منیر
امید ہے خدا سے کہ قبل از اجل منیر
قید سے یوں کر ہو گی رہائی

زتر تعریف حیدر ہو ہمارے ہاتھ میں
دیکھے مزار نفس رسول کریم کا
نامتوجہ مرا امام نہ ہو گا

قید سے ہندوستان میں ہند سے تا کربلا
صفِ علی سے ہوئی ہے حل مشکل اے منیر
خوب سرسبز ہوئی کشت تمنائے منیر
منیر ان دنوں مضطرب یا علیؑ ہے
جانے کبھی کے حج و زیارت کو اے منیر

اے منیر اک روز عشقِ پنجتن لے جائے گا
جائے وظیفہ ورد رہے ہفت بند کا
گھر کر ابر کرم سیّدِ سجاد آیا
خدا کے لئے مشکلِ سخت حل کر
عاجز ہیں قحط زر سے زادِ سفر سے ہم

## معاملہ بندی اور خارجیت

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ منیر اپنے دور کے دوسرے شعرا کے کلام سے اور اس مخصوص ماحول سے متاثر ہوئے جو اس زمانے میں ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ انھوں نے بھی اپنے کلام میں معاملہ بندی، واقعہ نگاری اور خارجیت یعنی محبوب اور اس کے خارجی لوازم کا بیان، زنانہ لباس، آرائش و زیبائش کے تذکرے جابجا کئے مگر اس قسم کے اثرات پہلے دو دیوانوں (منتخب العالم و تنویر الاشعار) میں زیادہ ملتے ہیں۔ اور آخری دیوان میں مقابلتاً کم۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

بوسہ بھی آ دکھا کے گزک لختِ جگر کی
چہرہ تمام سرخ ہے محرم کے رنگ سے
بغل کی نہ باتوں باتوں میں مکدر ہو گئی

یوں ہضم نہ ہو گا کبھی نذرانہ ہمارا
انگیا کا پان دیکھ کے منہ لال ہو گیا
گفتگو ئے بوسہ سے رنگیں دہن سیلا ہوا

اتنا نہ کیجیے گلِ رخسار پر غرور
دو دن کی یہ بہار ہے آج آئی کل گئی

للہ جو بوسہ کبھی مانگا تو وہ بولے
یہ حسن خداداد ہے خیرات نہیں ہے

چڑھتی ہیں بھنویں ہونٹوں کا جب لیتے ہیں کچھ
میٹھی ہے چھری آپکی تلوار نہیں ہے

پہ چھو پسینہ بیٹھ کے جانی پلنگ پر
لازم ہے آج عطر فشانی پلنگ پر

تمہاری بالیاں یاقوت کی لفوں میں جب چمکیں
چراغوں سے ہو ظلمات میں عالم دوالی کا

وصل کی شب یہ صدا آتی ہے گھڑیالوں سے
ساتھ لائی ہے قیامت کی سحر آج کی رات

بالوں کے ہوتے ہوئے انگیا پہ آنچل کس لیے
دونوں پٹے تم نے جب چھوڑے دوپٹہ ہو گیا

پان مسّی کو دخل نہیں بزم حسن میں
بے رنگ ہے ہنوز مرقع جمال کا

پان کھا کر گرمیاں کرتے ہیں غیروں کے حضور
آتش یاقوت سے ہے جی جلانے کی ہوس

جوبن کی سرکشی سے جو برہم حضور ہیں
انگیا کی چار بندی کی قصدیں ضرور ہیں

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیر کے یہاں معاملہ بندی تو ملتی ہے لیکن اپنے معاصرین یا پیش رو لکھنوی شعرا کے مقابلہ پر اظہار جذبات میں کچھ احتیاط بھی ملحوظ رہتی ہے اور انکی شاعری ابتذال اور عریانی کی حد تک نہیں پہونچتی۔ کھُل کھیلنے سے احتراز کرتے ہیں لیکن یہ مروجہ مذاق سخن کو بالکل نظر انداز بھی نہیں کرپاتے ان کے مزاج اور انکی طبیعت میں بڑی حد تک متانت اور سنجیدگی تھی۔ لیکن زندگی کے تقاضوں اور عوام کے رنگین مذاق سے مجبور ہو کر وہ اس قسم کے اشعار بھی اپنی غزلوں میں شامل کر لیتے تھے یہاں تک کہ ان کی وہ مثنوی جو خالص مذہبی کہی جا سکتی ہے اس میں بھی رنگین مزاج عوام کے مذاق کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے ایسے مواقع نکال لئے کہ جس میں خارجیت اور مناظر فطرت کی عکاسی کرکے پڑھنے والوں کی دلچسپی قائم رکھ سکیں نیر نے صبح کے وقت دریا کے کنارے کا منظر پیش کرتے ہوئے جو خواتین وہاں آتی ہیں حسب ذیل الفاظ میں اس کا نقشہ پیش کیا ہے۔

نشیلی انکھڑیاں نیچی نگاہیں
جھجک لینے کی ہچکانے کی راہیں

دم صبح اس غضب کا رنگ و روغن
نہ دیکھا باسی پھولوں پہ یہ جوبن

ادا بگڑی ہوئی بھی سو پھبن سے
نمایاں رات کی مل دل بدن سے

ادا سے چولیاں باریک مسکی
خبر دیتی تھیں تب کے رنگ رس کی

کہے دیتی تھی کھینچا کھینچ کل کی
غضب تھیں کرتیاں بیٹوں کی ہلکی

زبانیں خشک نیندیں چھا رہی تھیں
لبوں کی سرخیاں پپڑا رہی تھیں

تنا انگڑائی لینے میں جو سینہ
حیا سے آگیا فوراً پسینہ

نشاں گورے بدن میں سرخ نیلے
سراسر چوٹیوں کے پیچ ڈھیلے

منیر تقریباً سو اشعار اسی رنگ میں لکھتے چلے گئے ہیں۔ پھر ان کی متانت و سنجیدگی اس بے اعتدالی کے لئے عذر خواہ ہوتی ہے اور اس طرح اپنی بے محل اور بے جوڑ گستاخ نگاری کی معذرت کرتے ہیں۔

اگرچہ ہے فضائل کا یہ دفتر
حدیثیں آیتیں ہیں نظم اکثر

نہ تھا زیبا کہ آتا اس میں یہ رنگ
لگایا ناحق اس آئینہ میں زنگ

یہ تھا اس مثنوی کی شان سے دور
ہوا رنگیں مزاجوں سے میں مجبور

خدائے رحم گستر عفو فرمائے
پئے آلِ پیمبر عفو فرمائے

## تشبیہات و استعارات

لطفِ کلام اور انداز بیان میں مزید لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کرنے کے لئے ہماری شاعری میں تشبیہ و استعارے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ مگر یہ رجحان جب لکھنؤ کی سرزمین تک پہونچا تو اس نے یہاں کی فطری نازک مزاجوں اور رنگین نوازیوں کی بدولت ایک خاص رنگ اختیار کرلیا۔ شاعری کے علاوہ زندگی میں بھی اس کی پرچھائیاں ہر طرف نظر آنے لگیں اور نظم و نثر بلکہ روزمرّہ کی بول چال میں بھی یہ چیزیں مقبول خاص و عام ہوگئیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ

لکھنؤ کے عوام ایسے ایسے تشبیہ و استعارے استعمال کر جاتے ہیں کہ دوسرے
مقامات کے فصحا اور بلغاء حیران ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ منیرؔ کی شاعری بھی
تشبیہ و استعارے کے پُر لطف اور دل نواز استعمال سے مالا مال ہے اور
جا بجا ان کے کلام میں ایسے لطیف تشبیہ و استعارے ملتے ہیں جو انکے
معیارِ سخن کو اپنے معاصرین میں بلند مرتبہ اور بیش قیمت بنا دیتے ہیں۔ ان کی
تمثیل نگاری ہر لحاظ سے قابلِ داد کہی جا سکتی ہے۔ مثلاً:-

رنج سے کم نہیں احسان بھی خونخواروں کا
دھوپ سے تیز ہے سایہ ہمیں تلواروں کا

آب آئینہ عارض سے جو محفل بھیگی
فرش جھاڑوں پہ بچھا شبہ ہے فواروں کا

دانت چمکے جو ہنسی میں ترے ہنگامِ شتا
موجوں پہ شبہ ہوا موتیوں کے ہاروں کا

پڑا ہے کس کے حسنِ سبز کا پرتو شبِ وصلت
چراغِ خانہ پرتو ہے زمرد کی پیالی کا

تیرگی تھی یہ شبِ غم میں معاذ اللہ یا اللہ
راستہ بھول گیا قافلہ سیاروں کا

## پُرگوئی اور قادر الکلامی

منیر شکوہ آبادی نے بعض اوقات اپنی ایک ایک غزل میں پچاس پچاس شعر لکھے ہیں۔
معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ایک دریائے سخن ہے جو امڈا چلا آتا ہے یا ایک سیلاب
تخیل ہے کہ بے پناہ رفتار کے ساتھ اشعار کی صورت میں بہہ نکلا ہے۔ اور قافیہ
و ردیف کی کوئی دشواری اس کی راہ میں حائل نہیں ہو رہی ہے۔ کبھی یہ صورت ہوتی

ہے کہ وہ جو زمین شعر اختیار کرتے ہیں۔ اس میں قافیہ اور ردیف بدل کر دو غزلہ سہ غزلہ کہتے چلے جاتے ہیں اور مشکل و بے جوڑ ردیف اور قافیوں میں اپنی طبیعت کی جولانیاں دکھاتے ہیں۔ حالانکہ یہ کام آسان نہیں ہے اس کے لئے بڑی جگرکاری پختہ مشقی اور سخت کوشی اور وقت نظر کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کی طویل غزلیں پڑھ کر ان کی غیر معمولی ذہانت، استادی اور پُرگوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔

میر نے اپنے دور کے حالات سے متاثر ہو کر ہر غزل میں کچھ شعر حکمت و بصیرت کے کچھ تصوف و معرفت کے کچھ عاشقانہ اور کچھ رعایت لفظی کے کہے ہیں کبھی کبھی کچھ اشعار میں آپ بیتی اور کچھ میں ملک کی تباہی کا ماتم کیا ہے اور کچھ میں صرف معنی آفرینی اور ندرت نگاہی کا مظاہرہ کیا ہے اس طرح میر کی ایک غزل میں مختلف رنگ سخن ملتے ہیں۔ یہی ان کا کمال سخن وری اور کمال قدرت بیان ہے

## زبان دانی اور شستہ بیانی

زبان کی صفائی میں میر نے خاص کوشش کی ہے۔ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ زبان اس قدر صاف ستھری منجھی اور بامحاورہ نظر آتی ہے۔ اگرچہ ایک طرف ان کے کلام میں معاملہ بندی، رعایت لفظی، ہوسنائی نسائیت، کھلم کھلا عشق و محبت کا بیان اور تصنع و بناوٹ کے عنصر شامل ہو گئے تھے تو دوسری طرف میر اور اس دور کے دوسرے شاعروں کی بدولت زبان کی بھی اصلاح ہوئی تھی جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد ناسخ کے لئے لکھتے ہیں:-

عموماً کلام ان کا شاعری کے ظاہری عیبوں اور لفظی سقموں سے بہت پاک ہے۔ اس امر میں انھوں نے اتنی کوشش کی ہے

کہ اگرچہ ترکیب کی چستی یا کلام کی گرمی میں فرق آجائے مگر اصول ہاتھ سے نہیں دیتے۔" ۵۸

لکھنؤ میں تحقیق الفاظ کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کی ابتدا شیخ ناسخ نے کی۔ اور شاگردوں نے پایۂ تکمیل تک پہونچایا۔ رشک، بحر، سحر، جلال، برق، منیر۔ امیر اور واجد علی شاہ اختر نے مناسب الفاظ کے انتخاب میں نہایت جانفشانی کی۔ غرض ناسخ اور ان کے شاگردوں کی کوشش سے زبان کی اصلاح کے ساتھ تذکیر و تانیث کے اصول باقاعدہ طور پر منضبط کئے جانے لگے اور سختی سے ان کی پابندی کی گئی۔ الفاظ ٹھیک سے استعمال ہونے لگے۔ لکھنؤ کی مخصوص زبان کے متعلق نجم الغنی کا بیان ہے

"اسی زبان میں ظفر، خواجہ وزیر علی وزیر، میر زبیر علی صبا، رند، رشک، تلق، اسیر، امیر اللہ تسلیم، حکیم ضامن علی جلال، بحر، منیر، امانت، منشی امیر احمد مینائی امیر اور داغ کہتے رہے۔ ان لوگوں کی زبان آج ہمارے واسطے سند ہے۔ اور یہ لوگ زبان اردو کو ایسی حالت میں کر گئے ہیں کہ جب تک کوئی طرز جدید نہ پیدا ہو تب تک زبان کچھ حاجت اصلاح و مداخلت کی نہیں رکھتی"۔ ۵۹

منیر نے نہایت صحیح طور پر الفاظ کو برمحل اور محاورات کو مناسب مواقع پر اور مخصوص مفہوم کے ساتھ استعمال کیا ہے اگرچہ ناسخ اور رشک کی قدردانی آج زبان کی اصلاح کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ لیکن منیر بھی ان سے

---

۵۸۔ آب حیات۔ محمد حسین آزاد۔ صفحہ ۳۴۶

۵۹۔ بحر الفصاحت نجم الغنی خاں صفحہ ۲۸ زبان اردو سنہ ۱۹۱۰ء

کسی طرح کم نہیں تھے۔ انھوں نے خود ایک معیار سخن اپنے ذہن میں قائم کیا تھا اور اس کی پابندی خود اپنے اور دوسروں کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ وہ ایک بلند پایہ زبان دان تھے۔ اور اظہار بیان میں جھول انکو بالکل پسند نہیں آتا تھا۔ وہ اپنے عہد کے کچھ بے احتیاط شاعروں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اردو زبان ہوگئی ہندوستان میں مسخ — وہ بات، وہ محاورہ، وہ گفتگو نہیں
متروک لہجۂ فصحا و ثقات ہے — معنی وہ ہیں کہ جنمیں نزاکت کی بُو نہیں
مجبور شعر کہنے کی عادت سے ہوگئے — اس قسم اس مذاق کی گو آبرو نہیں
اب چند شعر پڑھئے نئے رنگ کے منیرؔ — مطبوع طبع یاروں کی یہ گفتگو نہیں

**منیر اور اساتذہ لکھنؤ** منیر ناسخ کے شاگرد تھے۔ اس لئے ان کے اثرات ان کے کلام میں بیشتر نمایاں ہیں۔

لکھنؤ کی ایک خصوصیت محبوب کے لوازم ظاہری اور متعلقات خارجی کا تذکرہ ہے۔ یہ رجحان ناسخ اور منیر دونوں کے کلام میں بکثرت پایا جاتا ہے ناسخ لکھتے ہیں۔

تیرا مالا موتیوں کا تنزل کرتا ہے مجھے — اے پری مالا اسمرہ ہی کا یہ مالا ہوگیا
بوسہ لیتی ہے ترے بالے کی مچھلی اے صنم — ہے ہمارے دل میں عالم ماہی بے آب کا
بستا ہے جو کندن کا بدن ہر ایک حلقے سے — تری جالی کی کرتی میں ہے عالم کامدانی کا
کس قدر صاف ہے تمھارا پیٹ — صاف آئینہ سا ہے سارا پیٹ

اب اسی رنگ کو منیر شکوہ آ[illegible] کے کلام میں ملاحظہ فرمائیے۔

سن لیجئے انگیا کی محبت کی حقیقت — چڑیا کی کہانی نہیں قصہ مرے دل کا
بال سلجھا کے بلائیں تری ہم لیتے ہیں — پائوں چھونے کے بہانے سے قدم لیتے ہیں

تمھارے پیٹ کا کرتی سے نکلا نور چھن چھن کر — نگینِ ماہ کا خانہ بنا ہر خانہ جالی کا

رعایتِ لفظی کے استعمال میں ناسخ اور منیر کی مماثلت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

بوسۂ لبِ یاقوت رنگِ یار کا — دل ہمارا ان دنوں کانِ بدخشاں ہو گیا

خوب موزوں ہم سے وصفِ قدِ بالا ہو گیا — عالمِ بالا تک اپنا بول بالا ہو گیا

تیرے در پر کب سے کرتا ہوں سوال — عاشق آنکھوں کا ہوں دو بادام بھیج

منیر کے اشعار :-

غیر آنکھیں نہ دکھائیں سحر و شام مجھے — نہیں درکار یہ پھوٹے ہوئے بادام مجھے

پان کھا کر گرمیاں کرتے ہیں غیروں سے حضور — آتشِ یاقوت سے ہے جی جلانے کی ہوس

ناسخ کی شاگردی کے بعد منیر کو رشک شاگرد ناسخ کے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ اور اس شاگردی نے بھی اپنا بھرپور رنگ دکھایا۔ رشک بالعموم طویل غزلیں لکھتے تھے۔ اس لئے ان کو اکثر بھرتی کے قافیہ اور مضمون بھی لانا پڑتے تھے۔ ایک خصوصیت یہ بھی ان کے پیش نظر رہتی تھی کہ جس قافیہ اور ردیف میں غزل لکھی جائے۔ اس میں کوئی قافیہ چھوٹنے نہ پائے اور ردیف بھی امکانی طور پر ہر پہلو سے استعمال میں آجائے۔ ایک غزل جس کے قافیے ہیں "پلاؤ۔ بلاؤ۔ دکھاؤ۔ اور ردیف "نہیں" ہے۔ باقی سب قافیے تو رشک نے لکھ دئیے ایک بلاؤ باقی رہ گیا تھا جس کو کسی ستم ظریف نے یوں پورا کر دیا ؎

دور سے جھیجھڑے دکھاؤ نہیں — رشک بیٹھا ہے بن بلاؤ نہیں

منیر کے دواوین میں بھی اس طرح کی غزلیات ملتی ہیں جن میں ہر پہلو سے ردیف کو استعمال کیا گیا ہے اور کوئی قافیہ چھوڑا نہیں گیا ہے۔ مثلاً ایک غزل "نظم منیر" (دیوان سوئم) صفحہ ۸۸ تا صفحہ ۱۹۱ پر ہے اس میں

۱۴۰ اشعار ہیں اور جس کا مطلع ہے ؎

دل آمدِ خط پر بھی ہے دیوانہ کسی کا
ہے سبز پری سبزۂ بیگانہ کسی کا

اس غزل میں چوبیس قافیے مستعمل ہوئے ہیں۔ جن میں مستانہ تین بار، جدانہ دوبار، دیوانہ چھ بار، ویرانہ سات بار، پیمانہ آٹھ بار، مردانہ دوبار، پروانہ تین بار اور شانہ دوبار استعمال ہوا ہے اور جداگانہ، بیگانہ، یارانہ، پری خانہ، طفلانہ، سیہ خانہ، کلیجانہ، تمھارانہ، میخانہ، تھانہ اور تسکرانہ قافیوں کا استعمال ایک بار ہوا ہے۔ بعض قافیہ بہت غیر معولی ہیں۔ مثلاً "تھانہ" جو کہ بہرے کے معنی میں، اس غزل کی ردیف ہے "کسی کا"۔ جس کا استعمال بھی اپنے مفہوم کے اعتبار سے مختلف طریقہ سے کیا گیا ہے مثلاً :۔

دل زلف میں پھنستا ہے تو پھنسنے دو بلا سے نقصان ہمارا، نہ تمھارا، نہ کسی کا
کھلتا نہیں کس پر دلِ خود رفتہ ہو وحشی جب پوچھئے کہتا ہے کہ دیوانہ کسی کا

وہ غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن میں دبیر سے اصلاح لیتے اور ان کے بنائے ہوئے اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔

ناسخ، رشک کے ساتھ ساتھ منیر دیگر اساتذہ لکھنؤ سے بھی متاثر اور مستفیض ہوئے اور اپنے کلام پر بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً صبا کے لئے لکھتے ہیں :۔

کیوں نہ ہو یادِ صبا کی مجھے ہر لحظہ منیر
دوست ہو دوستوں کا یار ہو وہ یاروں کا

منیر کو صرف لکھنؤ کے شاعروں سے ہی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہاں کے ادیبوں، عالموں اور مذہبی قسم کے بزرگوں سے بھی ان کو خاص عقیدت تھی اور تقریباً سب ہی کا تذکرہ ان کے کلام میں جہاں بھی موقع ملا ہے موجود ہے۔ لکھنؤ

کی رنگ رلیاں اور ادبی صحبتیں منیر کو وہاں پر مستقل رہنے کے لئے مجبور کرتی تھیں مگر کئی بار ان کو مجبوریوں کی وجہ سے لکھنؤ چھوڑنا پڑا ہے۔ بہرکیف ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ منیر کو لکھنؤ اور وہاں کے اساتذہ سے خاص طور سے اپنے استادوں سے خاص دلچسپی تھی۔ ایک غزل میں لکھتے ہیں ؎

منیر اس سال عزم لکھنؤ کس واسطے چھوڑا
نہ دیکھی چہل کے تیرنا سخِ مغفور کیا باعث

# باب چہارم

## منیرؔ کی غزلیات اور قطعات تاریخ

ہمارے ادب میں اردو غزل کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ غزل کے لغوی معنی ہیں "سخن از زنان گفتن" یعنی عشق و محبت کرنے اور عورتوں کے متعلق بات چیت کرنے کے ہوتے ہیں۔ صنفِ غزل کی ابتدا محض عشقیہ مضامین کے لئے ہوئی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ ایک مدت گزرنے کے بعد وہ اپنے اصلی مفہوم پر قائم نہ رہ سکی۔ اور ہندوستانی، ایرانی اکثر شعراء نے غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف و اخلاق، مناظرِ قدرت اور مسائل حیات کو بھی شامل کر لیا ہے۔ غزل تمام اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ اہمیت کی مالک ہے۔ کیونکہ بچے جوان اور بوڑھے سب کو اس صنفِ سخن سے دلچسپی ہے۔ اکثر شادی و بیاہ کی محفلوں، وجد و سماع کی مجلسوں میں، لہو و لعب کی صحبتوں میں برابر گائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ غزل کے اشعار ہر موقع اور ہر محل پر پڑھے جاتے ہیں۔ اور جب لوگ لمبی چوڑی نظموں کو پڑھنے کی فرصت نہیں رکھتے تو وہ غزل کے مختلف اشعار بڑے شوق سے پڑھتے ہیں اور ان سے حالاتِ زندگی کی مطابقت کر کے لطف لیتے ہیں:-

اردو غزل کی ترویج کے سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ شمالی ہند کے مقابلہ میں ملک دکن کچھ آگے رہا۔ دکنی شاعری کے ابتدائی دور کی غزلیں اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔ اردو غزل کے اولیں دور کے شعرا میں ولی دکنی سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ولی نے اُردو غزل کو بالکل نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش کیا۔ بقول عبادت بریلوی :-

"ولی نے اردو غزل کو ایک نیا آہنگ دیا، ایک نئی لے عطا کی، ایک نیا لہجہ اور نئی آواز سے آشنا کیا۔ اس نئے آہنگ نئی لے نئے لہجہ اور نئی آواز نے اردو غزل کو نئی زندگی بخشی اور اس میں نیا خون دوڑایا۔" [۵۹]

نتیجہ یہ ہوا کہ ہر کس و ناکس کے دل میں غزل نے جگہ بنالی اور ہمارا قصہ نگاری کے سلسلے میں اس طرح کے شعر سننے کو ملے۔

عجب کچھ حسن رکھتا ہے شب خلوت میں گلرو سے
سوال آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

شاہ حاتم، فغاں اور مظہر کے بعد سودا۔ میر درد اور میر تقی میر نے غزل کو نہایت دلکش، دلنشیں اور دلگداز انداز بیاں سے آشنا کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں جو سادگی و سلاست کا بہترین نمونہ ہیں اور شاعر کے دلی جذبات اور انفرادیت کو مجسم بنا کر پیش کرتے ہیں۔

کٹتی نہیں ہے رات، نہ آتی ہے مجھ کو نیند
جس کو پکارتا ہوں وہ کہتا ہے مر کہیں (سودا)

---

۵۹ غزل "مطالعہ غزل" عبادت بریلوی صفحہ ۲۲۶ (شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۵ء)

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہو (میر)
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز اسی خانہ خراب کی سی ہے (میر)

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں ایہام بھی نہیں (میر)

زمانے کی رفتار اور شعرا کے مزاج اور طبیعت کی مطابقت میں غزل کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ عشقیہ مضامین کے علاوہ سیاسی وسماجی' حیات وکائنات کے مسائل پیش کئے جانے لگے۔ غزل کو اردو شعرا نے معراج کمال پر پہنچایا۔ سودا نے جذبات دل کی ترجمانی بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے اور ہندوستانی زبان میں بلند پایہ مضامین بڑی سادگی وسلاست سے پیش کئے ہیں۔ میر نے غم والم کا ذکر اپنے اشعار میں بیشتر کیا ہو اور مصائب ہجر کو اکثر موضوع سخن بنایا ہے۔ میر درد کے کلام میں تصوف چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ مومن نے تغزل کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں۔ غالب نے ہر موقع پر اپنے کلام میں نئے زاویے نکالے ہیں اور صنف غزل کو فکر ذہن ذہن ودماغ سب کچھ عطا کر کے سب کے لئے قابل اعتنا بنا دیا ہے۔ غرضکہ ان سب شاعروں نے عشقیہ شاعری کی اور ایسے اشعار کہے کہ جو دوستی ومحبت کے تمام انواع واقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہیں۔ علاقائی معاشرت اور سماجی زندگی کے زیراثر ایک وقت وہ آیا کہ جب عورت اور اس کے لوازمات' زیورات ولباس کا کھلم کھلا اور بے تکلف ذکر ہونے لگا۔ اس طرح سے غزل میں جو داخلیت اور وانتیت تھی کم ہوگئی اور شاعری کے دو اسکول قائم ہو گئے لکھنؤ اسکول اور دہلی اسکول جو اپنی خصوصیت اور خدمات کے لحاظ سے غیرفانی شہرت حاصل

کر چکے ہیں۔

لکھنؤ کی خوش قسمتی کہ دہلی کے نشوونما پائے ہوئے شاعر اور ادیب یہاں آئے اور لکھنؤ کی عیش و عشرت کی زندگی سے متاثر ہونے لگے۔ دولت و ثروت کے ساتھ کسی حد تک علوم قدیمہ میں ترقی ہوئی۔ ظاہر ہے کہ لکھنؤ کے لوگوں کو یہ خیال آیا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ان کو فوقیت حاصل ہے۔ اسی طرح لب و لہجہ اور زبان میں دلی والوں پر برتری حاصل ہو لیکن ایسا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان کی اور دلی کی زبان میں کوئی امر مابہ الامتیاز پیدا کیا جائے۔ اس فرق کو شاعری میں ظاہر کیا۔ جیسا کہ ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں :-

"دلی سے نکل کر لکھنؤ آئے تو نفیس و تخیل اور بہ ظاہر کون نظر آتا ہے، رنگ رلیوں میں تصوف کم ہو گیا۔ مادی دنیا سے وابستگی زیادہ ہو گئی۔ لیکن جذبات میں سطحیت بھی آ گئی۔ رنگینیوں میں زندگی کی اعلیٰ قدروں پر توجہ کم ہوئی۔"[۹۵]

غزل اپنی قدیم وضع پر قائم نہ رہ سکی۔ خصوصاً ناسخ اور آتش کی بدولت غزل نے اپنا رنگ الگ قائم کیا۔ اور ادب میں "زبان دانی" زور آزمائی اور پہلوانی کے معرکے سر ہونے لگے۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں خاص طور سے زبان کی ساخت اور اصلاح معنی و بیان کو اہمیت دی گئی۔ بندش الفاظ اور جملوں کی ترتیب، محاکات نگاری اور خارجی لوازمات پر زیادہ زور دیا گیا لکھنؤ اور دہلی دونوں دبستان شاعری اس زمانے میں اپنے عروج پر تھے غزل کی قدیم روایات کو برقرار رکھتے ہوئے جدید روایات کو شامل کرنے کی

---

۹۵ اردو ادب آزادی کے بعد۔ ڈاکٹر اعجاز حسین صفحہ ۲ (۱۹۶۰ء)

سرگرم کوشش جاری تھی۔ اس طرح سے غزل کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا۔

## (الف) میر بہ حیثیت غزل گو

میر کی غزل گوئی میں حکمت، معرفت، بصیرت، علوئے فکر، پاکیزگی خیال اور فلسفہ و تصوف کے ایسے ایسے جواہر پارے ملتے ہیں، جنہیں دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ میر کا نام بھی اردو کے نامور شعرا میں لیا جا سکتا ہے۔ ان کی غزلیات کے سلسلے میں عقیل احمد جعفری لکھتے ہیں:-

"ہر سنگلاخ زمین میں خاک اڑا دینا ان کا حصہ تھا ورنہ قادر وہ ہر رنگ پر تھے۔ غزل میں بہت شعر کہتے۔ خود گوئی میں امیر کے بعد عجب نہیں ان کا درجہ ہو۔ مجھے ان کی دو غزلیں، دو شعر اب بھی یاد ہیں اور ایک زبان کا بھی۔ زبان پر بعض کے نزدیک قادر نہ تھے مگر میں نے ان کی لغزش کا اثر کسی سے نہیں سنا" [۹۲]

ڈاکٹر رفیق حسین فرماتے ہیں:

"ناسخ کے شاگردوں کی تعداد بہت کافی تھی لیکن ان میں مشہور ہوئے وزیر، برق، رشک، بحر، منیر ان میں سب سے زیادہ فطرت کے فطری شاعر تھے" [۹۳]

ڈاکٹر حسین فاروقی نے میر کی غزل گوئی پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:-

"میر کے اشعار میں حیات و کائنات کے رموز پر روشنی ڈالی ہے۔ عشق مجازی کے ساتھ عشق حقیقی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

---

۹۲۔ نثر ریاض خیرآبادی۔ مضامین اور خطوط کا مجموعہ۔ مرتبہ عقیل احمد جعفری صفحہ ۵۰ تا ۵۱

۹۳۔ اردو غزل کا نشوونما۔ ڈاکٹر رفیق حسین۔ صفحہ ۲۱۵ (بار اول ۱۹۵۵ء)

اور تخئیل کی عرش پیمائی اور وہ سب کچھ ہے جس کی ادب عالیہ یا کلاسکی لٹریچر میں توقع کی جاتی ہے۔"[۹۴]

ناسخ نے زبان میں، وزیر نے تشبیہ و استعارہ میں، نسیم نے اپنی مثنوی میں مرصع شاعری کا نمونہ پیش کیا۔ آتش انداز تغلق نے سلاست بیان میں، بحر نے سوز و گداز میں، امانت نے رعایت لفظی میں نام روشن کئے۔ مگر منیر شکوہ آبادی نے اپنے ہم عصر شعرا کے کلام سے استفادہ کیا اور ان سب خوبیوں کو جن کی ہر طرف قدر و منزلت کی جاتی تھی۔ ان میں پوری طرح دسترس حاصل کرنے کی کوشش کی۔ صنائع لفظی اور معنوی کا لاجواب استعمال کیا ہے۔ بقول لشن نرائن حامی:۔

" ایہام، طباق، لف و نشر مرتب و مراعاۃ النظیر، تجنیس تعلیل غرض جتنی صنعتیں شاعری میں عام ہیں۔ سب برتی ہیں اور بڑی بے ساختہ برتی ہیں۔ کہیں تکلف کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا ہے ہر چند کلام میں کہیں کہیں آورد بھی ہے کہ لازمہ معنی آفرینی کا ہے مگر زبان پر قدرت اس قدر ہے کہ اکثر جگہ آورد پر آمد کا دھوکا ہوتا ہے۔ ایک مدت سے شاعری کی وہی فرسودہ روش چلی آتی تھی آپ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے نئی نئی تشبیہوں اور تازہ تازہ استعاروں سے اہل سخن کو روشناس کرایا۔ پرگوئی کا یہ عالم ہے کہ جن طرحوں میں دس شعر کی غزل مشکل ہے۔ تیس تیس، چالیس چالیس شعر نکالے ہیں۔ ایک قافیہ کو الگ رنگ سے باندھتے اور ہر دفعہ کوئی نیا مضمون پیدا کر لیتے ہیں۔ متفرق غزلوں میں عدہا شعر حاصل

---

۹۴ تنقید ہفت روزہ (بمبئی) ایڈیٹر وسیم لکھنوی مضمون "منیر شکوہ آبادی" ذاکر حسین فاروقی صفحہ ۸

زمین ہیں کہ اس سے بہتر وہ قافیے نہیں بندھ سکتے ۔"[۹۵]

علاوہ ازیں منیر کی غزلیات میں جو مختلف خصوصیات پائی جاتی ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

۱۔ تصوف و اخلاق ۔
۲۔ مذہب و عقیدت
۳۔ رعایت لفظی
۴۔ واقعہ نگاری و معاملہ بندی
۵۔ تشبیہات و استعارات کا روایتی استعمال ۔
۶۔ سوانح حیاتی اشارے ۔
۷۔ حسن ادا و مضمون آفرینی
۸۔ ماہرانہ فن کاری اور علمی و مقامی اصطلاحات
۹۔ الفاظ کا برمحل صرف، لطف زبان و حسن محاورہ
۱۰۔ حسن تغزل وغیرہ وغیرہ ۔

## ۱۔ تصوف و اخلاق

منیر کے کلام کا بالتفصیل تجزیہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے کلام میں اپنے اساتذہ کی خصوصیات کے علاوہ انفرادی رنگ بھی پیدا کیا ۔ ان کے کلام میں علمیت کی تہ ان کے علاوہ تصوف کے مسائل اور اخلاقی مضامین بھی اکثر و بیشتر پائے جاتے ہیں ۔ تصوف کا رنگ منیر کے یہاں ابتدائے شاعری سے ملتا ہے ۔ مگر رفتہ رفتہ عمر اور تجربے کے بڑھنے اور مزاج میں پختہ کاری آنے کے ساتھ یہ رنگ تیز تر ہوتا جاتا

۹۵ آجکل دہلی ۱۵ ستمبر ۱۹۴۹ء صفحہ ۱۱ (مضمون منیر شکوہ آبادی از منشی مرائن رامی)

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیوان سوم میں متصوفانہ مضامین زیادہ ملتے ہیں۔ اور دیوان اول و دوئم میں بالمقابل کمتر ملتے ہیں۔ انھوں نے مسئلہ توحید، مشاہدۂ حق رسول کی تعریف، فقر و غنا، غرور کی برائی، خاکساری، کسر نفسی، جبر و اختیار، دنیا کی بے ثباتی، زندگی کی ناپائداری، انسان کی غفلت شعاری، سرمایہ داری سے نفرت اور دولت و سلطنت سے بے تعلقی وغیرہ مختلف موضوعات و مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ ان کے دواوین سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

شوق ہو آئے شاہد مضموں اگر توحید کا
شانہ کر زلفوں میں بسم اللہ کی تشدید کا

اے گل نہیں ثبات کسی رنگ کو یہاں
پایا ہے باغ دہر نے پانی حباب کا

اک روز آئے گا وہ ادائے ایں میں بے حجاب
سمجھو قنات پردۂ چشم کلیم کو

ایک ایک ہاتھ کاسۂ چشم کلیم ہے
سائل ہوں میں تجلی حسن و جمال کا

کفر و اسلام نے مقصد کو ہو سمجھنے نہ دیا
کعبہ و دیر کو سنگ رہ منزل سمجھا

آنکھوں میں بھی سینہ میں بھی دل میں بھی مکیں ہو
کس پردہ میں پوشیدہ نہیں ذات تمھاری

مانگے کی چیز پر کوئی کرتا نہیں گھمنڈ
بے جا ہے فخر زندگی مستعار کا

دنیا نہیں ہے جائے توقف چلے چلو
اجڑی ہوئی سرائیں ٹھہرنا ضرور کیا

بھولا ہوا ہے کس کے بھروسے پر آدمی
اس مشت خاک کو ہے الٰہی غرور کیا

کونسی شکل میں دیکھا نہیں نقشہ تیرا
نظر آتا ہے ہر آئینہ میں چہرہ تیرا

نہ تو دوزخ سے علاقہ ہے نہ جنت اپنی
دیکھیے لے کے کہاں جائے گی قسمت اپنی

اسباب دنیوی میں سے ہم نے اٹھا لیا
تسبیح پاک، خاک شفا، لنگ و بوریا

فضل خدا سے گوشۂ عزلت ہے سلطنت
میرے لیے ہے ظل ہما لنگ و بوریا

جی کے مرنے سے تو بہتر تھی بقا بعد فنا
خوب تھا ہو کے نہ ہونے سے نہ ہو کر ہونا

رنج و راحت میں جدا سب سے ہے رنگ اپنا — آگ فردوس میں دوزخ میں گلِ تر ہونا
بندہ عاجز نہ ہو تدبیر کے یہ معنی ہیں — اپنی تقدیر سے بھی چاہیئے بڑھ کر ہونا
چار دن روح کو تکیہ ہے بدن پر ناحق — صاحبِ خانہ کی قسمت میں ہے بے گھر ہونا
سو گئے ہیں سلاطینِ جہاں خاک کے نیچے — مسند ہے نہ تکیہ ہے کچہری ہے نہ دربار
کملی کا عجز بڑھ کے گیا بامِ عرش تک — شیخی زبک کے خلعتِ شاہی میں رہ گئی
کلیم کے یدِ بیضا سے ہو گیا روشن — چراغ لے کے جو ڈھونڈھو خدا کی راہ ملے ۱۵۱
سب ہیں مجاز دوست حقیقت پسند ہیں — بندہ ادھر تمام زمانہ اُدھر رہے
یا رب نہیں تلاش قلیل و کثیر کی — سائل نہوں کسی سے دعا ہے فقیر کی

حسب ذیل اشعار میں میرؔ نے اخلاقیات پر نہایت دل چسپ اور پر اثر انداز سے روشنی ڈالی ہے :-

سنتے تھے ہم تو ہو انسان غرض کا بندہ — آج کیوں سخت مصیبت میں خدا یاد آیا
عبث کہتے ہو کوئی ہم سا نہ ہوگا — خدا کی خدائی میں کیا کیا نہ ہوگا
ہمت بڑی ہے قطرۂ ناچیز ہیں تو کیا — شبنم کرے گی مہرِ منور سے اختلاط عہ
راستہ بھلاتے ہیں لوگ رہنما ہو کر — کشتیاں ڈبوتے ہیں یار ناخدا ہو کر
باغِ جہاں میں خواہشِ دولت فضول ہے — کہتے ہیں اشرفی جسے گولر کا پھول ہے
تلاشِ رزق نہ بھٹکائے آدمی کو اگر — مزے سے زیست گزر جائے ایسی راہ ملے
بال پکے عمر آخر ہو چلی آنکھ کھول — آفتاب آتا ہے سر پہ دوپہر ہونے کو ہے
کیوں انقلابِ دہر سے اے دل اداس ہے — اللہ مہربان ہے تو ناحق ہراس ہے
بحرینِ غم و رنج سے نکلا نہیں جاتا — پھر جاتے ہیں آ آ کے کناروں کے برابر

---

عہ اقبال نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے :-
نہ اٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگِ گل تک بھی — یہ رفعت کی تمنا ہے جو لے اڑتی ہے شبنم کو

## ۲. مذہبیت و عقیدت

منیرؔ کی غزلیات میں مذہبیت کا عنصر اکثر ملتا ہے جیسا کہ باب دوم میں بھی بیان کیا جا چکا ہے ان کو اپنے مذہب سے خاص لگاؤ تھا۔ تقریباً ہر غزل کا مقطع کچھ نہ کچھ مذہبی رنگ لئے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی پریشانیوں میں اماموں سے امداد کے خواستگار ہوتے ہیں اور کہیں زیارت کربلا کی تمنا کا اظہار کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ان روزوں منیرؔ ہے پریشان ۔ مشکل آسان یا علی ہو

اکسیر اس نے پھینک دی ہاتھوں سے اے منیرؔ جس کو غبار راہ مشہد لا انتہا ملا

تابع نہیں جو شخص منیرؔ آل نبی کا زنہار وہ مقبول خدا ہو نہیں سکتا

پہونچا دے ہند سے جو مدینہ میں اے منیرؔ یہ بات ہو عنایت خالق سے دور کیا

یا علی حشر میں محروم نہ رہ جائے منیرؔ لے کے جنت میں اسے اے مرے مولا جانا

پہونچے تو نقد روح لٹا دیں گے اے منیرؔ اس سال میں اگر سفر کربلا ہوا

یارب وہ دن دکھا کہ یہ چرچا ہو شہر میں سر سے منیرؔ روضۂ شبیرؑ تک گیا

بفضل خدا سے بخت اگر جاگیں اے منیرؔ جاتے ہی کربلائے معلیٰ میں آئے نیند

منیرؔ ان دنوں مضطرب یا علی ہے خدا کے لئے مشکل سخت حل کر

جاتے کبھی کے حج و زیارت کو اے منیرؔ عاجز ہیں قحط فرصت و زاد سفر سے ہم

قید فرنگ سے ابھی چھٹتا ہوں اے منیرؔ امید ہے خدا سے خدا کے حبیب سے

نہایت ہے منیرؔ افسردہ دل طول اسیری سے مدد کو یا علی آؤ دم مشکل کشائی ہے

حل ہو منیرؔ خستہ کی مشکل بھی یا علی ماں باپ میرے اور میں قربان آپ کے

جاروب کشی ملتی اگر کرب و بلا کی ہاتھوں سے منیرؔ اور کوئی کام نہ لیتے

حاشا نہیں وہ بندۂ بے صاحب اے منیرؔ جس کا جناب حیدری سا امام ہے

سرخ پوشی ہوئی یہ خونِ شہیداں سے عام — کالے کپڑے نہ ملے ماہِ محرم کو بھی

حمدِ خدا سے پہلے درودِ نبی پڑھوں — یہ بسملہ ہو سورۂ حامیم کے لئے

## ۳۔ رعایت لفظی

شاعری ہمیشہ اپنے ماحول کی آئینہ داری کیا کرتی ہے اور جس قسم کا عالم اپنے گرد و نواح میں پاتی ہے۔ اسی سے موضوعات لیا کرتی ہے۔ چونکہ منیر کو لکھنؤ اسکول سے خاص تعلق تھا لہذا قدرتی طور پر انھوں نے رعایت لفظی کا بہت احترام کیا ہے۔ اور تقریباً ہر شعر میں وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ الفاظ کے برمحل صرف کے علاوہ ایک لفظ سے دوسرے لفظ کی مناسبت نظر انداز نہ ہونے پائے۔ مثلاً

مرضِ عشق کے بدلے مرضِ سل ملتا — کاش پتھر مجھے یا رب عوضِ دل ملتا

بھنووں کی یاد نہ تڑپائے گی جینے بھر — ہمارے ہاتھ اگر خنجرِ ہلال آتا

دم بھر کی زیست اجنبیوں میں بسر ہوئی — خشکی میں تھا حباب تری میں سراب تھا

کب پان رقیبوں کو عنایت نہیں ہوتے — کس روز مرے قتل کا بیڑا نہیں اٹھتا

دخلِ نظارہ نہیں ان روز دل حسنِ عشق میں — اس دو عملہ میں اٹھایا تھا جو تھانہ کیا ہوا

نازک کلائیوں کی جو تعریف کا ہو قصد — مضمون ہاتھ باندھے رہے دستبند کا

کیا مُہر بنائی ترے یاقوتِ سخن کی — مانندِ نگیں ہم نے انگوٹھی میں جڑی بات

باریکیاں زمانے کی تیری کمر میں ہیں — اک بال بھر جگہ میں سمایا جہاں بھر

آئے جو دل میں تیغِ ادا کھینچ کر حضور — پھرے تمام صبر و تحمل کے ہٹ گئے

ہم روسیاہ الجھیں رہیں گے مہینہ بھر — منہ سے ہٹاؤ زلفِ سیہ چاند رات ہے

احساں نہیں خواب میں آئے جو میرے پاس — چوری کی ملاقات، ملاقات نہیں ہے

دل چھپا ہو تیری محرم میں تماشا اور ہے — لے پری آگیا کے تنگلے میں یہ کمرا اور ہے

پھول زرد چاندنی ہو تو ے گھر بسنت میں — شاید چراغِ ماہ میں سرسوں کا تیل ہے

**۴۔ واقعہ نگاری و معاملہ بندی** جیسا کہ باب دوم میں تفصیل بیان ہو چکی ہے کہ میر کے اول اور دوم دیوان میں اس قسم کے اشعار زیادہ ملتے ہیں جس میں معاملہ بندی اور واقعہ نگاری کا عنصر ہو۔ تیسرے دیوان میں اس قسم کے اشعار کی تعداد کم ہے۔ یہاں پر چند مثالیں لکھی جاتی ہیں جس سے اندازہ ہو سکے کہ میر کی غزلوں میں معاملہ بندی اور واقعہ نگاری کس نمونے کی ملتی ہے۔ جیسے:-

اُنکی ہر بات میں اک بات ہے ماشاء اللہ — چھیڑنا آپ ہی اور آپ ہی تھرا جانا
زلفیں جو بناتے ہو تو للہ سمجھ کر — بگڑے نہ اُلجھ کر دلِ دیوانہ کسی کا
اُبھرے ہوئے جوبن کو بچائے ہوئے رہیئے — اب تھم نہیں سکتا دلِ دیوانہ کسی کا
ہیکل جو ہلتی ہے تو آتا ہے دل کو چین — بجتا ہے خوب ساز تمہارے سمند کا
رو پڑا دیکھ کر مسکا ہوا جب مجھکو تنگ رزا — تو بولے کیا اجارہ ہے ترے چاکِ گریباں کا
مانگا جو میں نے بوسۂ ابرو تو کیا ہوا — تم نے زبانِ تیغ سے ناحق دیا جواب
منھ میں مرے زبان کبھی دی تو لی کبھی — رہ رہ بدل رہی یہ زبانِ پلنگ پر
غیر مہندی ان کے ہاتھوں میں ملنے لگے — سوکھتا ہے خون میرا دیکھو ان دنوں
عُریاں اگر حضور ہوئے وصل میں تو کیا — باقی ابھی تو سیکڑوں پردے حیا کے ہیں
بیتابِ سخت شوق ہیں جوبن کے روبرو — بوسے ہیں جاں بلب ترے گالوں کے سامنے
زلفوں کو ہٹا کر رخِ انور سے شبِ وصل — کہتے ہیں سرِ شام سے اب رات نہیں ہے
غیروں نے اپنے ہاتھ سے پہنائیں بالیاں — ہم نے چھوا تو دکھنے لگے کان آپ کے
تکیہ کبھی بنائیے سر رکھ کے سوئیے — کچھ تو مزے اُڑائیے مری ران آپ کے
وہ اٹھ چلے تو میں نے ادب سے بڑھ کے کہا — گستاخ ہاتھ ان کی کمر سے لپٹ گئے

**۵۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال** میر کے یہاں نہایت نادر

غیر معمولی تشبیہ و استعارے نظر آتے ہیں اور قابلِ قدر بات یہ ہے کہ تشبیہ و استعارے میں اُلجھ کر مضمون کی لطافت اور بنیادی خصوصیات نظر انداز نہیں ہونے پاتیں۔ چنانچہ منیر استعارات و تشبیہات میں اس قدر زنگ ہو کر بھی واقعات نہایت خوبی سے بیان کرتے ہیں جیسا کہ افضل حسین ثابت نے لکھا ہے:

"مولوی شبلی کی طرح اس زمانے کے بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ جو شاعر استعارہ و تشبیہ سے زیادہ کام لیتے ہیں وہ واقعات کی تصویریں نہیں دکھا سکتے۔ منیر مرحوم کی نظموں اور مثنوی مذکورہ کو دیکھیں اور اپنے دعوئے خیالی کو واپس لیں"۔[۹۶]

غزلوں میں منیر بالکل اپنے اساتذہ کی تقلید میں مراۃ النظیر اور لفظی تلازمات و استعارات کے پابند تھے۔ غزلوں کا بہت کچھ حصہ اسی انداز کا حامل ہے قدرت نے ان کو ایسی ہمہ گیر طبیعت عطا کی تھی کہ قادر الکلامی میں سب سے گوئے سبقت لے گئے تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

لالہ رویوں کو عبث سنگدلی کا ہے شوق
لعل دریا قوت کو پھر زیبا ہے پتھر ہونا

ترا باغ میں ہوگا جو پسینہ سے وہ گل رو
نچھیں گے عروسانِ چمن عطر دولہن کا

چہرہ جو شبِ ماہ میں زلفوں سے چھپایا
اندھیر ہوا چاندنی میں چاند گہن کا

کسی خوش چشم کے کوچہ کا سودا ہو گیا شاید
صبا کی چال میں عالم ہوا نبض غزالی کا

آنکھیں کھو بیٹھے ہیں ہجر میں رونے والے
پتے داغوں کو چھڑا دیتے ہیں دھونے والے

پیری ہے صبح و شام جوانی کے واسطے
مہمان شمع حسنِ شباب رات بھر کی ہے

جانے لگے تم وادیِ ایمن میں جو شب کو
شمع ید بیضا لئے موسیٰ نکل آیا

ہر جنبشِ ابرو میں ہوئے سیکڑوں زخمی
تلواریں چلیں تیرے اشاروں کے برابر

---

۹۶۔ دربارِ حسین۔ افضل حسین ثابت صفحہ ۲۶

## ۶۔ سوانح حیاتی اشارے

میرؔ نے اپنے حالات کا جا بجا تذکرہ غزلوں میں بھی کیا ہے۔ ان کی غزلوں کے مقطع میں استادوں کی تعریف یا اپنی زندگی کے کسی واقعے کی طرف اکثر اشارہ ملتا ہے۔ اس لئے ان کی سوانح عمری لکھنے میں ان کے کلام سے کافی مدد مل جاتی ہے۔ مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ اُردو کے تمام شاعروں میں یہی ایک ہستی گزری ہے، جس کا کلام ان کی سوانح عمری کی تکمیل میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ انھوں نے جو فارسی دیباچہ اپنے دیوان اوّل کے شروع میں لکھا ہے اگر نہ لکھتے تب بھی بالغ نظر ناظرین ان کے حالات زندگی کی بیشتر تفصیلات ان کے کلام سے اخذ کر لیتے یہی نہیں بلکہ اس عہد کی ملکی کیفیت، عام مذاق اور دوسری باتوں کا عکس بھی کسی حد تک ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔ مثلاً ۱۸۵۷ء کے غدر کے حالات، درباروں کی خستہ حالی۔ عوام کی بے روزگاری شعرائی طرف سے لوگوں کی بے التفاتی۔ اہلِ کمال کی کس مپرسی۔ ساہوکاروں کے شدائد۔ عمال کی زیادتیاں اور بدعنوانیاں۔ روسا کی ظاہرداریاں۔ درباروں کی حالت اور اہلِ غرض کی ریشہ دوانیاں۔ غرضکہ سب کی ہوبہو تصویریں ان کے ادبی سرمائے میں موجود ہیں۔ جنگ آزادی کے دوران ان کی شاعری نے اکثر و بیشتر انقلابی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ ان کی غزلوں میں ہندوستان کی بربادی کا ایسا نقشہ ملتا ہے جس کو پڑھ کر آج بھی اہلِ دل کی رگوں میں خون اُبلنے لگتا ہے۔ غزلوں کا مطالعہ کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں ایک تڑپ ہے، ایک نالہ پرسوز ہے جو غزل کے قالب میں ڈھل کر صفحۂ قرطاس پر آگیا ہے۔ مثلاً:-

دوستانِ رفتہ کی روداد کس سے پوچھئے　　بات کے لائق کوئی شہرِ خموشاں میں نہ تھا

اک دوست وقتِ بد میں نہ مجھ کو چھپا سکا
بھیک بھی اہلِ ہنر کو اب کہیں ملتی نہیں
گزرے کئی ہزار کے اسباب و مال سے
منیر قید سے چھوٹ کر وطن نصیب ہوا
اوقات کا فتور میں ضائع نہ کر منیر
زنداں میں اٹھی سال مسیحی کہو منیر
سرخ پوشی یہ ہوئی خونِ شہیداں سے عام
اس جزیرے کو چلے ہند سے مجبور ہو منیر
نام کو سب ہیں مگر صاحبِ شاں کوئی نہیں
ہو گئے برباد شاہانِ سلیماں منزلت
عیش سے گزری جوانی تو منیر
مشتاق ہیں عروج کے جاتے ہیں کانپور
کیا الٰہ آباد کے احباب یاد آئے منیر
سوئے کلکتہ الٰہ آباد سے پیدل چلے
مسجدیں ٹوٹی پڑی ہیں صومعے ویراں ہیں
پست رتبہ بڑھتے ہیں گھٹتے ہیں عالی منزلت
تعزیہ خانوں میں خاک اڑتی ہے جلتی ہے تراب

میں خانماں خراب خوشی کی خبر ہوا
اے فلک تو نے کہاں رزق مقدر رکھ دیا
اس وقت ہاتھ آئے ہیں کیا لنگ و بوریا
ہزار شکر کہ جیتا میں اپنے گھر آیا
چل لکھنؤ میں صحبتِ اہلِ کمال دیکھ
حال روی ہے نظم، ماہ اگست ۱۸۶۲ء کی
کالے کپڑے نہ ملے ماہِ محرم کو بھی
کہ نہ تھی جس کی خبر آدم و عالم کو بھی
اس جگہ تقدیر لائی ہے جہاں کوئی نہیں
اب بلائیں ہوں تو کیا دنیا میں برپا ہو گیا
عہدِ پیری میں مصیبت ہی سہی
دل اس خیال سے نہیں خالی ہے آن بھر
کیوں ہوا بیتاب بسمل کی طرح اک بار دل
چوب ور لنگ پر سکھیں سواری بیڑیاں
یادِ حق میں ایک شب لہائے سوزاں ہو گیا
دفترِ ارض و سما زیر و زبر ہونے کو ہے
غم سے آنکھیں صورتِ زخمِ شہیداں ہو گیا

## ۷۔ حسن ادا اور مضمون آفرینی

حسن ادا اور انداز بیان کے سلسلے میں کہہ سکتے ہیں کہ منیر نے معمولی سے معمولی مضمون کو نرالے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ ان کی طبیعت کی ندرت مضامین کی تخم ریزی پتھر سے پتھر زمین کو گلزار بنا دیتی ہے۔ باریک بینی اور مضمون آفرینی

کی شریت کے تو منیر گویا پیغمبر ہیں۔ اشعار میں وہ وہ باتیں پیدا کر دیتے ہیں کہ جہاں دوسروں کا خیال بھی نہیں پہنچ سکتا ہے۔ دربار رامپور کی ادبی محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے "آج کل دہلی" میں بشن نرائن حامی نے لکھا ہے :-

" ایک دفعہ خلد آشیاں کے دربار میں اسیر، امیر، داغ، جلال، شاغل، حیا، تسلیم وغیرہ سبھی باکمال موجود تھے سب نے اپنی اپنی غزلیں پڑھیں۔ منیر صاحب بھی موجود تھے انھوں نے بھی ایک غزل پیش کی۔ مگر جب اس شعر پر پہونچے کہ :

دھدھکی پہنادی اس خوش قد کو کس استاد نے
یہ مرصع لفظ اس مصرع میں کیونکر رکھ دیا

لوگوں نے ہاتھوں سے غزلیں رکھ دیں اور کہا کہ اس شعر کے بعد اس زمین میں کچھ پڑھنا بے کار ہے۔" ۵۹؎

"دھدھکی" کے لفظ کا اتنا برمحل صرف کیا ہے کہ اس وقت کی لکھنؤ کی معاشرت اور لکھنوی انداز بیان کی خصوصیت کی ہو بہو تصویر سامنے آگئی ہے دھدھکی ایک مرصع زیور کو کہتے ہیں جو اس طرح پہنا جاتا ہے کہ وہ حلقوم اور سینے کے بیچ میں رہے اس غزل کا مطلع اور چند دوسرے قابل توجہ اشعار حسب ذیل ہیں :-

عجز و نخوت نے قدم جب حد سے باہر رکھ دیا
پاؤں پر سر میں نے اس نے پاؤں سر پر رکھ دیا

دیگر اشعار :-

---

۵۹؎ - آجکل دہلی ۱۵ ستمبر ۱۹۴۹ء (مضمون بہ عنوان "منیر شکوہ آبادی" مصنف بشن نرائن حامی بریلوی)

نشے کے حیلے سے اس نے نامہ بر کی جاں لی — اے بطِ مے تیرے سر خونِ کبوتر رکھ دیا

ہوتے نہ خود بیں جو دیکھا خسروانِ عہد کو — روبرو آئینۂ حالِ سکندر رکھ دیا

مضامین کی بہتات اور تازگی خیالات سے کلام طلسمات نظر آتا ہے۔ جتنے نئے مضامین ان کے یہاں ملتے ہیں کہیں اور نہیں ملتے ہیں۔ اکثر اشعار ذو معنی ہوتے ہیں۔ ان کی غزلیات میں مضمون آفرینی لاجواب ملتی ہے اور نیز عام تصورات سے اپنے تصور کو الگ رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اگر کبھی معمولی اور مروجہ تصورات کو کام میں لاتے ہیں تو ان کو مزید وسعتیں دے کر دلکش تر بنا دیتے ہیں مثلاً:-

سرگشتہ ہے کونین میں کیوں پیک تصور
عالم ہے زمانے سے جدا انکا نہ کسی کا

دیگر مثالیں:-

فراقِ یار میں ہر طرح دن گذر جاتا — قضا جو رحم نہ کھاتی تو کیا میں مر جاتا

گھونگھٹ سے ترے کان کی بالی نظر آئی — دیوار چمن توڑ کے پتا نکل آیا

سنتے ہوئے شاعرے میں آؤ ایک دن — مصرع تو طرح ہو کبھی قد بلند کا

کچھ جوانی ہو ابھی کچھ ہو لڑکپن ان کا — دو دو غبارا دل کے قبضے میں ہے جوبن انکا

بجلی تھی مہربان کبھی آتش بہار — صد شکر بے چراغ مرا آشیاں نہ تھا

انکے جاتے ہی نہ ٹھہرے گی بہار بزم عیش — ساتھ اپنے ایک گل سارا چمن لے جائے گا

مہمان ایک رات رہا صبح چل دیا — خوش خوئی دلہن کی ہمارا شباب تھا

حرم و دیر میں یکساں ہے جلوۂ پرتو ان کا — دو گھروں کا ہے چراغ اک رخ روشن انکا

میں چاہتا ہوں بعد کسی کو خدا کی شان — چپ رہئے بس یہ آپ کے کہنے کی بات ہے

معمور اگر عیش محل ہے امرا کا — آباد خرابی سے ہے ویرانہ کسی کا

مارا تو ہاتھ آپ نے دشمن کے ہاتھ پر — کیسی لگی یہ چوٹ مرے دل سے پوچھئے
افسانۂ شباب خدارا نہ پوچھئے — دیکھا ہے جس کو جاگتے میں یہ وہ خواب تھا
یاد نہیں کہ چھوڑ کے کس سمت کھو گیا — ڈھونڈو وہیں کہیں دلِ خانہ خراب تھا
مِل اب جاتے ہیں بادِ صبا سے ہم تم — وہ بھی کیا دن تھے کہ لڑتے تھے ہوا سے ہم تم
ہمت بڑی ہے قطرۂ ناچیز ہیں تو کیا — تسلیم کرے گی نہر سمندر سے اختلاط
سنتے تھے ہم کہ ہے انساں غرض کا بندہ — آج کیوں سخت مصیبت میں خدا یاد آیا

## ۸۔ ماہرانہ فنکاری اور علمی و مقامی اصطلاحات

ماہرانہ فن کاری سے مراد ہے کہ

منیر نے ردیف اور قافیہ کا لاجواب استعمال کیا ہے۔ ناسخ اور آتش کے یہاں فارسی تراکیب اور فارسی الفاظ کی بہتات پائی جاتی ہے۔ اور انھوں نے مشکل ردیف و قافیوں میں پوری پوری غزلیں بھی کہی ہیں چنانچہ منیر بھی استاد سے متاثر ہوئے اور غزل میں انھیں قیدوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر رام پور پہنچنے پر ان قیدوں کی پابندی ضروری نہ رہی۔ ایک بار نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور نے ایسی طرح معین کی کہ جس میں تقریباً ہر استاد شاعر کی غزل موجود ہے اس "طرح" میں ناسخ کا مشہور و معروف مطلع ملاحظہ ہو:

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہو میرے گریباں کا

نواب رامپور نے خواہش ظاہر کی کہ اس "طرح" میں منیر بھی غزل لکھیں اور "گریباں" کا قافیہ خاص طور سے پیش نظر رکھیں۔ منیر نے عذر پیش کیا کہ استاد ثانی حضرت رشک کے ارشاد کے موافق حقیر ایسا قافیہ غزل میں بغیر عطف یا اضافت .

کے نہیں لا سکتا۔ کیونکہ عطف اضافت کے بغیر لانے سے نون کا اعلان واجب ہے اور اعلان ہونے کی صورت میں مصرعہ ہی ناموزوں ہوا جاتا ہے۔ بحر تقطیع سے نکل جاتی ہے۔ مگر جب نواب رام پور کا اصرار کم نہ ہوا۔ تو منیر نے ۴۷ اشعار کی غزل لکھ کر پیش کر دی۔ مطلع ہے ؎

اگر چھڑوائے آزادی علاقہ بند زنداں کا
الف کھنچوائے ماتھے پر جنوں چاک گریباں کا

دیگر اشعار حسب ذیل ہیں:۔

مرے در پر گدایانہ صدا دیتا ہے یوں مجنوں
کوئی ٹکڑا ملے مجھ کو بھی دامان و گریباں کا

شبِ تیرہ میں کیا وحشت کو بھی رستہ نہیں ملتا
ہوئی صبح اور دروازہ کھلا چاکِ گریباں کا

کریں قطع تعلق اہل دنیا خوش لباسی سے
جو منفر اعتوں میں نقشہ ہو رے چاکِ گریباں کا

آخر میں فرماتے ہیں:۔

خداوند نعم کے حکم سے چارہ نہ تھا ورنہ
نہ کہتا یہ غزل ہی ذکر کیا جیب و گریباں کا

منیر افسردہ ہوں پابندیٔ عطف و اضافت سے
نہیں تو لطف دکھلاتا مضامینِ گریباں کا

مقطع سے ظاہر ہوتا ہے کہ منیر خود بھی ایسے التزام کے نقصانات کو سمجھتے تھے۔ مگر استاد یعنی حضرت رشک کی ہدایت کی پابندی کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ چاک گریباں کا موضوع ایسا ہے جس کو تقریباً سب ہی

شاعروں نے اپنے اپنے طریقہ سے نظم کیا ہے۔ مثلاً میر کا شعر ہے۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

منیر نے اس کو یوں نظم کیا ہے۔

کیا ہاتھ مرے پہنچیں گے دامانِ زباں تک   اپنے ہی گریبان سے فرصت نہیں ملتی

منیر کو سنگلاخ زمین اور مشکل قافیہ بے حد پسند ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں فنی اور علمی اصطلاحات کے استعمال کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

شراب لالہ گوں کی جم رہی ہے یخ پہاڑوں میں
ہوئے جاڑے سے گلابی فصلِ مے آئی ہے جاڑوں میں

بدون گرمیِ دورہ کشتیِ مے کا نہیں ممکن
مرے پاس آتی ہے بنت العنب چڑھ کر نواڑوں میں

چڑھائے نشہ میں نیزوں پر اپنے عاشقوں کے سر
نئی صورت کی تم نے لنیاں باندھی ہیں تاڑوں میں

ازل سے مرے دل میں ہے نقشِ وحدت   یہ کعبہ نہیں ہے جو بت خانہ ہوگا
ٹوٹنے کی دلِ مجنوں کے صدا آئے گی   چاک لیلیٰ کا اگر پردۂ محمل ہوگا
شادی کرو دل عروس مضامین نور سے   نکلے برات کو جو بین اسطور سے
گردوں کی بے بساطیوں سے دل اچاٹ ہے   مہتاب کے بھی چاندنی میں ایک پاٹ ہے
شادی ہے دخترِ رز سے کسی مے پرست کی   توبہ کے در پہ بجتی ہے نوبت شکست کی

## ۹۔ لطفِ زبان و حسنِ محاورہ

منیر نے الفاظ کی تحقیق، اساتذہ کے کلام سے سند کی تلاش، محاوروں کا

صحت کے ساتھ استعمال کرنا اپنا خاص اُصول بنا لیا تھا۔ علاوہ ازیں اکثر محاوروں کے استعمال کا بہت شوق تھا اور جب موقع ملتا تھا وہ محاوروں کا استعمال کرتے تھے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں :-

گھی کے چراغ خرمنِ ہستی نہ کیوں جلائے ۔۔۔ مدت میں آج برقِ نظر کا گذر ہوا
لگائے تم نے جو تیر نگاہِ غمزوں پہ ۔۔۔ ہمارے زخموں کی آنکھوں میں خون اُتر آیا
اک روز بھی نہ کوچے میں اس کے گذر ہوا ۔۔۔ سوم تبہ زمانہ اِدھر کا اُدھر ہوا
سختیٔ زہر ہوئی ہجر سخن میں آساں ۔۔۔ تا نیچے آئے جو پتھر کے میں پانی سمجھا
بتوں کے تذراست پہ عشق ہے ناصح ۔۔۔ یہ بے چارہ سیدھا مسلمان نکلا
بلبلوں کا سوم نہیں اے گل ۔۔۔ کیوں ترے منہ سے پھول جھڑتے ہیں
آہوں سے دلِ یار پسیجے تو مزا ہے ۔۔۔ ایسا کوئی پتھر جو پگھل جائے تو جانیں
اپنے چلنے سے خفا ہیں چمنِ عالم میں ۔۔۔ گل تو کیا چیز ہے اڑنا ہی ہوا ہے ہم کو
وہ بتوں کو ان دنوں تنکے سہارا دیتے ہیں ۔۔۔ عاجزی بے چارگی کی چارہ گر ہونے کو ہے
باغِ جہاں میں خواہشِ دولت فضول ہے ۔۔۔ کہتے ہیں اشرفی جسے گولر کا پھول ہے
تم نے گردن میں جو ڈالے دستہائے نازنیں ۔۔۔ دیکھئے وہ ہاتھ کا میرا کلیجہ ہو گیا

## ۱۰۔ حسنِ تغزل

حسنِ تغزل کے سلسلے میں مومن دہلوی صفِ اول کے شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مگر منیر کی غزل گوئی میں بھی یہ خوبی کافی حد تک ملتی ہے۔ غزل میں لب ولہجہ کی نزاکت، الفاظ کی شیرینی، اشارے و کنائے کا لطف، غم دوراں کو غم جاناں بنا دینا، مسائل حیات کو عشق و محبت کے رنگ میں پیش کرنا، بات کو اس انداز سے بیان کرنا کہ سامع کے دل پر فوراً اثر ہو وغیرہ کمال تغزل سمجھا جاتا ہے۔ اور یہی چیز حسن تغزل کہلاتی ہے۔ منیر کے کلام سے کچھ اشعار بطور نمونہ لکھے جاتے ہیں ؎

بس کہ ہر رنگ سخن کا ہو ترے قابو میں    جس نے جو بات کہی تیری زبانی سمجھا
مرا حال کیوں غیر سے سن رہے ہو    کہانی کسی کی، زبانی کسی کی
منیرؔ ان دنوں چھٹ گئی شعر گوئی    کہا کرتے ہیں ہم کہانی کسی کی
خلوت سرائے دل میں قدم رنجہ کیجئے    گوشے میں آئیے، مجھے کچھ التماس ہے
غیر جنس آپ کے رتبہ کو بھلا کیا جانے    پوچھئے یوسفِ بازار سے قیمت اپنی
رونا چلا ہوں صحبتِ احباب سے منیرؔ یوں    بلبل کو وداع ہوتے ہیں پھول اپنے باغ سے
نہ آبرو کے پیاسے نہ مال کے بھوکے    تمھاری بحر محبت کی ہم کو تھاہ ملے
وہ آرزو ہوں جس کو کوئی دل نہیں نصیب    وہ دل ہوں میں کہ جس میں کوئی آرزو نہیں
کیا بیٹھیں ہم حضور کی بزمِ نشاط میں    سب عیش بے مزہ ہیں اگر دل اُداس ہے
اک دن تو آکے دیکھئے کیا اڑ رہی ہے خاک    رہتے تھے آپ جس میں وہی دل اُداس ہے

مختصر یہ کہ منیرؔ اردو غزل گوئی میں نہ صرف وسعتِ خیال اور قوتِ ایجاد بلکہ علمی استعداد میں بھی اپنے دور کے دیگر شعرا سے بہتر اور ممتاز ہیں۔ طبیعت اسقدر رسا ہے کہ جن باتوں کو لوگ غور و فکر سے پیدا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں وہ سب مضامین بیش یا افتادہ ہیں:

منیرؔ نہ صرف اپنے معاصرین سے غزل گوئی میں متاثر ہوئے بلکہ اپنے سے پہلے دور کے شاعروں کا اثر بھی ان کی غزل گوئی پر پڑا۔ مثلاً منیرؔ نے غالبؔ سے بھی اکتسابِ فیض کیا ہے اور اس انداز میں بات کہی ہے جس میں غالبؔ کے دیوان میں اشعار ملتے ہیں مثلاً بطورِ نمونہ دو شعر پیش کیے جاتے ہیں:-

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا    (غالبؔ)

طفلی سے میں وہ مصحف الفت پڑھا کیا
ہر ایک پارہ جس میں الف لام میم تھا    (منیرؔ)

میں نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک (غالب)

اب تو روٹھے ہوئے جاتے ہو مگر یاد رہے
خواب ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک (منیر)

منیر نے ناسخ کے زمانے سے داغ تک کا زمانہ دیکھا تھا اور شعر و سخن اور انداز بیان میں وقتاً فوقتاً جو تبدیلیاں ہوئیں۔ ان کا بھی انھیں احساس تھا۔ اسی لئے انھوں نے تقریباً ہر انداز میں شعر کہے ہیں۔ لیکن بیشتر ان کے کلام پر قدیم رنگ سخن اور روایتی انداز بیان چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اور ان کی زندگی کے حالات، علمی اور مذہبی رجحانات بے تکلف ان کے کلام میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ منیر کا تعلق اگرچہ سلسلۂ ناسخ سے تھا مگر اپنی نکتہ رسی اور علم و فضل کی وجہ سے آتش اور شاگردانِ آتش بھی ان کی بے حد قدر و منزلت کرتے تھے۔ منیر کے کلام کا بہ غور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک زبردست عالم و فاضل ہیں۔ ان کی جامعیت و ہمہ دانی کی کیفیت ہے کہ جب تک مختلف علوم و فنون پر عبور کامل نہ ہو کوئی شخص ان کے کلام سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتا

منیر کو اپنی اس خصوصیت کا خود بھی احساس تھا۔ فرماتے ہیں ؎

ایسی غزل بلند کہوں اس زمین میں — ہر شعر خط بنے تدح آفتاب کا
ہر ایک شعر آیتِ اعجاز ہے منیر — قائل ہوں میں ترے سخنِ لاجواب کا

منیر کی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ اس عہد میں لکھنؤ کی ادبی صحبتوں میں اپنے لئے کوئی جگہ بنا ہی نہیں سکتا تھا جب تک کہ اس کے اندر غیر معمولی ذہانت اور صلاحیت نہ ہو۔ لکھنؤ اس وقت اُردو شاعری کا معیاری مرکز تھا۔ اور کسی شاعر کا ہر دل عزیز ہونا یا قدرت

کی نگاہ سے دیکھا جانا صرف اس کے شاعرانہ کمال پر منحصر تھا۔ منیرؔ نے وہ سب خصوصیات نہایت محنت، جاں فشانی اور عرق ریزی سے بہم پہنچائی تھیں۔ علمی حیثیت سے وہ ایک جامع اور قابل ہستی تھے۔ جس کی جھلک ان کی تو لیفات میں نمایاں ہے۔ جب تک لکھنؤ میں رہے انھوں نے لکھنوی انداز فکر و نظر کی پابندی پورے اہتمام کے ساتھ کی، لیکن لکھنؤ سے باہر جا کر انھوں نے مرصّع سازی اور تکلّف کو بعض اوقات بہت کچھ نظر انداز بھی کر دیا۔ اس حقیقت کا اظہار وہ خود اپنے ایک شعر میں کرتے ہیں۔

لکھنؤ میں تھی تعلّیِ خیال اپنی منیرؔ　　فرخ آباد میں ہم صاف کہا کرتے ہیں

منیرؔ کی ادبی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے مختلف شہروں میں بالخصوص کانپور، لکھنؤ، فرخ آباد، باندہ، رام پور اور الہ آباد وغیرہ میں انکے بے شمار شاگرد تھے۔ جو زیادہ تر صاحبِ دیوان تھے۔ بقول ذاکر حسین فاروقی؎

منیرؔ در اصل شعر و شاعری کا ایک چلتا پھرتا اسکول تھے۔ جہاں جاتے تھے وہاں کی شعر و سخن کی محفلیں آراستہ کر دیتے تھے اور اپنے کمالِ فن کے سہارے اس شہر کو اُردو کا ایک بڑا مرکز بنا دیتے تھے۔ آج جبکہ ہندوستان بھر میں اردو رائج ہے اور جگہ جگہ شاعر و ادیب موجود ہیں۔ اس خدمت کی اہمیت نہیں معلوم ہوتی ہو لیکن اس وقت جبکہ اردو محض دہلی اور لکھنؤ تک محدود تھی۔ فرخ آباد، باندہ، کانپور اور دوسرے کئی مقامات پر اردو شعر و ادب کا چلن عام کر دینا یقیناً ایک بڑی خدمت تھی۔ جس کا اعتراف کیا جانا ضروری ہے۔" ۵۹

منیرؔ ایک علم و ادب کا مرکز تھے۔ جس طرف ہو کر نکلتے تھے۔ انکی ادبی صلاحیتیں

---

۵۹ تنقید نمبر ہفت روزہ بمبئی۔ (مضمون منیرؔ شکوہ آبادی از ذاکر حسین فاروقی) صفحہ ۷

اپنے احباب اور مختلف حلقہ ہائے ادب میں مستقل اثرات چھوڑتی چلی جاتی تھیں جو ان کے وہاں سے چلے جانے کے بعد بھی قائم رہتے تھے۔ اور لوگوں کو شعر و سخن کی دل چسپیوں اور رنگینیوں سے لطف اندوز کرتے رہے۔

## (ب) منیر کی رباعیات و قطعات تاریخ

منیر کی رباعیات جن کی تعداد مجموعی طور پر ایک سو بیالیس ہے۔ مختلف قسم کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ کچھ رباعیوں سے ان کی زندگی کے حالات، مختلف مقامی واقعات اور ذاتی مشکلات وغیرہ وغیرہ کی تفصیلات ملتی ہیں اور کچھ میں مذہبی عقاید کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں جن کا تذکرہ ان کی سوانح حیات میں موقع بہ موقع کیا گیا ہے اور جن کی بدولت ہمیں منیر کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کی شخصیت اور زندگی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

منیر کو تاریخ گوئی کا بے حد شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تاریخی قطعات کے علاوہ کچھ غزلوں کے مقطعوں میں تاریخیں نکالی ہیں۔ منیر کے اس شوق سے ان کی ذات کو بہت فائدہ پہونچا ہے اور مختلف امرا و نوابین کے درباروں اور اس دور کی تمام بڑی بڑی ہستیوں کا تعارف انکی تاریخ گوئی سے ہو جاتا ہے

دیوان اول میں تاریخی قطعات نمبر ایک[1]۔ دو[2]۔ تین[3]۔ چار[4]۔ پانچ[5]۔ چھ[6]۔ سات[7]۔ آٹھ[8]۔ نو[9]۔ دس[10]۔ گیارہ[11]۔ بارہ[12]۔ تیرہ[13]۔ پندرہ[15]۔ اکیس[21]۔ سینتیس[37]۔ اڑتیس[38]۔ اور انتالیس[39] سے منیر کے حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ باقی تاریخی قطعات سے معاصرانہ زندگی کے جن مختلف واقعات پر روشنی پڑتی ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

سنہ ۱۲۶۰ھ میں نواب تجمل حسین خاں کی کچھ طبیعت ناساز ہوتی ہے ان کے غسل صحت پر منیر نے خوشی کا اظہار کرنے کے لئے تاریخی قطعہ پیش کیا۔ نواب تجمل حسین نے سنہ ۱۲۶۱ء میں فرخ آباد میں نہر بنوائی۔ منیر نے اس سلسلے میں تین تاریخی قطعے لکھے۔ نواب تفضل حسین نے اپنی کوٹھی کی تزئین کی تو منیر نے سنہ ۱۲۶۳ھ میں تاریخ لکھی۔ اس تاریخ میں منیر نے سامان آرائش و زیبائش کی تفصیلات، بلندی و سجاوٹ، پائیں باغ۔ تہ خانہ وغیرہ وغیرہ کا نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔
سنہ ۱۲۶۴ء میں منیر نے چار تاریخی قطعات غسل صحت جناب عالیہ محل خاص نواب ذوالفقار علی بہادر بحکم نواب صاحب کہے ہیں۔ اسی سنہ ہجری میں نواب علی بہادر باندہ نے قرآن شریف حفظ کیا۔ منیر نے اس موقع پر تاریخی قطعہ پیش کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بہت بڑا جشن باندہ میں نواب ذوالفقار علی خاں نے منایا اور منیر کو بھی مدعو کیا مگر وہ کسی وجہ سے نہیں جاسکے اور انھوں نے حسب فرمائش صوری و معنوی تاریخ دل مادہ اور رسالہ میں کہہ کر روانہ کی۔ آخر اشعار میں کہتے ہیں:۔

بدون تعمیہ و تخرجہ کہوں تاریخ — کہ جس میں نظم ہو تاریخ روز ماہ و سال
ہوا ہے حکم معلیٰ اسی شرایط سے — مراد یہ ہو کہ کھل جائے زور طبع کا حال
حضور قدر شناس سخن ہیں سمجھیں گے — کریں گے قدر مری دیں گے مجھ کو داد کمال
کہی منیر نے صوری و معنوی تاریخ — وہ خطبہ اول شہر صیام نیک اقبال
سنہ ۱۲۶۴ھ

سنہ ۱۲۶۴ھ میں نواب تفضل حسین خاں والی فرخ آباد کا عقد ہوتا ہے منیر اس کی بھی تاریخ کہتے ہیں۔ اس قسم کی مختلف معاصرانہ واقعات اور حالات کی تاریخوں کے بعد آخر میں چند دوسروں کے کہے ہوئے تاریخی قطعات منیر

کے ترتیب دیوان کے سلسلے میں ملتے ہیں۔ ان میں پہلا قطعہ خود علی بہادر خاں کا ہے جس میں اپنے استاد منیر شکوہ آبادی کے دیوان کا تاریخی نام منتخب الوم رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ان کے استادوں رشک اور زبیر کے کہے ہوئے تاریخی قطعات ہیں۔ جس میں انھوں نے منیر کے دیوان اوّل کے تکمیل کی تاریخ نکالی ہے اور ان کے کلام کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس دیوان کی طباعت حکیم محمد حسن خاں طبیب کے زیر اہتمام ہوئی ہر انھوں نے بھی اس سلسلہ میں ایک قطعہ کہا ہے جس کے آخر شعر میں فرماتے ہیں:-

گفت سال عیسوی و فصلی و ہجری طبیب
نظم سحر و جوہر منظوم و کاخ شعر خوان
۱۲۶۴ھ ۱۲۵۶ فصلی ۱۸۴۸ء

ان حضرات کے علاوہ منیر کے شاگردوں نے بھی ان کے دیوان کی طباعت پر تاریخی قطعات پیش کئے ہیں:-

دیوان دوئم میں تاریخی قطعات کی تعداد بہ نسبت دیوان اوّل کے زیادہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منیر کو تاریخ گوئی سے دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی اس دیوان کے کچھ قطعات تاریخی سے ان کی سوانح عمری لکھنے میں غیر معمولی مدد ملی ہے۔ جگہ جگہ حوالہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فرخ آباد، باندہ کے رؤساء، حکماء اور منیر کے شاگردوں کی وفات۔ ولادت اور خاص خاص جشن وغیرہ کی تاریخوں اور مختلف واقعات اور حالات کا یقینی طور پر علم ہوتا ہے مثلاً نواب بیگم صاحبہ دختر نواب مظفر جنگ بہادر رئیس مسند نشیں فرخ آباد کا انتقال ۱۲۶۶ھ میں ہوا۔ اسی سنہ میں عمدۃ العرفان نواب سلطان بخش

صاحب فرخ آبادی کا انتقال ہوا۔ حسین علی بزم، غلام حسین برادر تحصیلدار فرخ آباد۔ شاگرد مرزا عوض بیگ فرخ آبادی نے ۱۲۶۶ھ میں انتقال فرمایا۔ ۱۸۵۱ء کے موسم سرما میں مبتلا کو نواب علی بہادر نے رہائش و آرائش کے لئے خستخانہ عنایت فرمایا۔ ۱۲۶۷ھ میں نواب علی بہادر نے ایک رنگین (غالباً عشقیہ) مثنوی نظم کی۔ اسی سنہ ہجری میں شاہ غلام اعظم صاحب افضل الہ آبادی کا دیوان مکمل ہوا۔ وزیر الممالک نواب روشن الدولہ بہادر صوبہ اودھ کا انتقال ۱۲۶۹ھ میں ہوا۔

نہ صرف شاعروں۔ استادوں۔ اپنے وقت کے رئیسوں اور نوابوں کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں کہیں۔ بلکہ انھوں نے ہر اس غیر معمولی واقعہ اور حادثے کو پیش نظر رکھا کہ جس سے خواص و عوام کو دلچسپی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے قطعات تاریخی میں اپنے وقت کے نامور اور سربرآوردہ ماہر موسیقی پیار خاں کی تاریخ وفات (۱۲۶۷ھ) کی طرف بھی توجہ کی اور بس عنوان "تاریخ مرگ پیار خاں سرگروہ علمائے موسیقی" سے اپنے دیوان میں شامل کی۔

ان کے قطعات تاریخ صرف واقعات یا حادثات کے سنہ تاریخ ہی کا تعین نہیں کرتے ہیں، بلکہ ان واقعات یا حادثات سے متعلق اکثر بیشتر کچھ تفصیلات بھی بیان کر دیتے ہیں۔ بالخصوص ذاتی طور پر مبتلا پر جن باتوں کا اثر ہوتا ہے۔ اس کو بہت واضح طور پر بیان کرتے ہیں جس سے انکے جذبات کی گہرائی اور معلومات کی وسعت کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کے قطعات تاریخ میں ان کی شاعرانہ عظمت بھی جھلکتی ہے اور مشق تاریخ گوئی کی غیر معمولی صلاحیت بھی۔

دیوان سوئم میں تاریخی قطعات کا مجموعہ پہلے دونوں دواوین سے زیادہ ہے جس کی تعداد ۲۹۰ ہے ان تاریخی قطعات سے پہلی جنگ آزادی یا غدر ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے مصائب کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس ہنگامے میں منیر کے شناساؤں میں کن کن ممتاز ہستیوں کو پھانسی لگی اور کن کن کا قتل کیا گیا۔ اس کے علاوہ منیر کے انڈمان جانے، راستے کے مصائب وہاں رہنے کی پریشان حالی اور زندگی کا انداز، وہاں کے حالات و نیز دیگر واقعات وہاں سے واپسی کے بہت کچھ تفصیلی حالات معلوم ہوئے ہیں۔ جن تاریخی قطعات سے ان کے حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کا حوالہ جگہ جگہ پیش کیا جا چکا ہے۔ باقی حالات کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

سنہ ۱۲۷۰ھ میں خلوت سرائے خاص کی تعمیر کی گئی۔ اسی سنہ ہجری میں شاہ کرنجی صاحب کے یہاں فرزند تولد ہوا۔ سنہ ۱۲۷۱ھ میں وزیر علی صبا کا انتقال ہوا۔ مرزا ولایت حسین جو پہلی جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں منیر شکوہ آبادی کے ساتھ فرخ آباد کے راستے میں گرفتار ہوئے تھے۔ سنہ ۱۲۷۰ھ میں نواب فرخ آباد کے دیوان مقرر ہوئے۔ باندہ کے کسی سیٹھ نے نواب پر دو بار نالش کی اور ان کی دوسری نالش بھی کامیاب نہ ہونے پر نواب نے ایک جشن سنہ ۱۲۷۱ھ میں منایا۔ سنہ ۱۲۷۲ھ میں جناب آغا علی خاں رئیس باندہ کا انتقال ہوا۔ اسی سنہ ہجری میں نواب حسین علی خاں ہزبر جنگ خلف الرشید نواب معین الدولہ بہادر رئیس فرخ آباد و حسین علی خاں کی وفات ہوئی اور منیر کو نواب باندہ نے لبادۂ زر یں سنہ ۱۲۷۲ھ میں عطا فرمایا۔ ریاست باندہ کے گرد و نواح میں "ہر دوئی مقام پر الٰہی بخش خاں نے مسجد کی تعمیر سنہ ۱۲۷۳ھ میں کی۔ سنہ ۱۲۷۰ھ میں زوجہ بندہ علی بیگ کا انتقال باندہ میں ہوا۔ سنہ ۱۲۷۲ھ میں منیر نے نواب باندہ کے دربار میں قصیدہ پڑھا جس کے

صلہ میں ان کو خلعت، اشرفیاں اور ہیرے کی انگوٹھی ملی۔ سنہ ۱۲۶۴ھ میں مولانا احمد حسن خان بہادر کی والدہ معظمہ کی وفات ہوئی۔ اسی سنہ ہجری میں مرزا عباس بیگ ملازم نواب باندہ کا انتقال ہوا اور سنہ ۱۲۶۹ھ میں شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی کا انتقال ہوا۔ سنہ ۱۲۷۳ھ میں سید العلما السید حسن مجتہد کی وفات ہوئی۔ سنہ ۱۲۷۲ھ میں مرزا محمد رضا خان بہادر مخاطب بہ فتح الدولہ برق لکھنوی نے دنیا سے کوچ فرمایا۔ سنہ ۱۲۷۲ھ میں نواب صاحب رئیس باندہ کے یہاں فرزند تولد ہوا اور سنہ ۱۲۷۳ھ میں لالہ مادھورام جوہر فرخ آبادی کے یہاں بھی پسر تولد ہوا۔ اسی سنہ ہجری میں نواب صاحب کی بیگم صاحبہ افتخار محل کے بطن سے ایک صاحبزادہ کی پیدائش ہوئی۔ غلام حیدر خاں کے کچھ زخم سنہ ۱۲۷۴ھ میں ہوگئے تھے جن کے اچھے ہونے کی نواب باندہ کو بہت فکر تھی۔ بفضل خدا سے ان کو اسی سنہ ہجری میں صحت مل گئی تھی۔ اسی سال منشی رحمت اللہ صاحب کا باندہ میں اور مرزا محمد باقر دہلوی کا انتقال ہوا۔ سنہ ۱۲۷۵ھ میں اودھ کے وزیر نواب منور الدولہ مرزا احمد علی خاں کا انتقال ہوا۔ سنہ ۱۲۷۵ھ میں واجد علیخاں رضوان نے منیر شکوہ آبادی کو ان کی پسندیدہ شے آم بھجوائے۔ سنہ ۱۲۷۶ھ میں لالہ مادھورام جوہر جو غالباً غدر یا پہلی جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ کے سلسلے میں بکڑے گئے ہوں گے رہائی پاتے ہیں۔ اسی سال آغا حیدر صاحب نفیس آبادی کی وفات ہوئی۔ امجد علی خاں بہادر کی سنہ ۱۲۷۴ھ میں شہادت ہوئی۔ سنہ ۱۲۷۵ھ میں نواب دولہ بہادر شمس آبادی اور نواب معین الدولہ باقر علی خاں بہادر جو غالباً غدر کے سلسلے میں پکڑے گئے ہوں گے کو رہائی ملی۔ اسی سن ہجری میں نواب باقر حسین خاں نے اپنے اشعار کی بیاض تیار کی اور اسی سال نواب واجد علی خاں بہادر رضوان کے یہاں دختر پیدا ہوئی۔ سنہ ۱۲۷۷ھ میں خوشی رام نے ایک کتاب تاریخ

انڈمان تصنیف کی۔ ۱۲۷۹ھ میں رونق جہاں بیگم صبیۂ رضیہ نواب واجد علیخاں
بہادر رعنوان فرخ آبادی کا انتقال ہوا۔ ۱۲۸۱ھ میں نواب عالی جاہ بہادر
لکھنوی کا انتقال ہوا۔ ۱۲۸۲ھ میں فرمانروائے رامپور نے ایک شاندار
جلوس نکالا۔ اس سال مرزا محمد جعفر اوج نے ایک رسالہ کی تالیف کی۔
۱۲۸۳ھ میں نواب علی بہادر والی باندہ نے منیر کو سفید دوشالہ نہایت لطیف قسم کا
اور نواب افتخار محل کے حضور سے ایک انگشتری زمرد بھیجی ہے اور ذوالقدر
بہادر نے ان کو آم بھیجے ہیں۔ جبکہ منیر انڈمان میں ہی تھے ۱۲۸۳ھ میں سی
ہی سید ناصر علی خاں بہادر ذوالقدر کا اور خورشید علی خاں صدر اعلیٰ کا انتقال
ہوا۔ اسی سال ولایت حسین نے موضع کہرا میں ایک کنواں بنوایا ۱۲۸۳ھ
میں نواب صفدر جنگ بہادر کا انتقال ہوا۔ ۱۲۸۴ھ میں سلطان العلما
برہان الفقہا سید المتکلمین سند المجتہدین مجتہد العصر کی وفات ہوئی اور اسی
سال جناب سید علی اوسط اشک لکھنوی استاد منیر نے دنیا سے رحلت فرمائی
اور افتخار الدولہ ہدایت علی خاں بہادر نے بھی اسی سال وفات پائی۔
۱۲۸۵ھ میں حافظ مقبول حسن خاں صاحب کے یہاں فرزند کی ولادت
ہوئی۔ ۱۲۸۵ھ میں نواب دولہ حج کی رہائی کے سلسلے میں منیر نے
تاریخ کہی ہے۔ ان کا الٹا ہاتھ جل گیا اور ۱۲۸۵ھ میں انھوں نے
کسی بیماری سے شفا پاکر غسل صحت کیا۔ ۱۲۸۵ھ میں ہی مرزا ہادی حسین
صاحب عطارد خلف اصغر جناب مرزا دبیر "کتخدائی" کا جشن ہوا۔ ۱۲۸۳ھ
میں حیدر علی خاں بہادر نے ایک بے نظیر لاجواب افسانے کی تصنیف
کی۔ ۱۲۸۵ھ میں مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کا انتقال ہوا ۱۲۸۵ھ
ہی میں جناب آغا حسن خاں صاحب نے محفل میلاد منعقد کی ۱۲۸۶ھ میں

منشی رجب علی خاں ارسطو جاہ بہادر نے انتقال فرمایا۔ اور اسی سال سید فرزند علی خاں فرخ نے دنیا سے کوچ کیا۔ سنہ ۱۲۸۰ھ میں نواب کلب علی خاں کے لڑکے "حامد علی خاں" کی شادی ہوئی۔ سنہ ۱۲۸۷ھ میں قدم آل ع کے گنبد کی تعمیر ہوئی اور منیر نے نقش قدم شاہ رسل گنبد طیب یا گنبد نقش کف پائے محمد اینجاست" کے مصرعے سے تاریخ نکالی ہے۔ سنہ ۱۲۸۷ھ میں منشی آغا سخاوت علی خاں صاحب کے یہاں فرزند کی ولادت ہوئی۔ میر خادم حسین صاحب زمیندار فتحپور نے امام باڑے کی تعمیر سنہ ۱۲۸۷ھ میں کی۔ فقیر محمد خاں صاحب نے جو شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے سنہ ۱۲۸۷ھ میں مثنوی اندر سبھا لکھی۔ اسی سال شاہ عبدالرشید پیر و مرشد حضور پر نور نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ سنہ ۱۲۸۸ھ میں نواب کلب علی خاں والی رام پور کو ہودج زریں ملا۔ اور اسی سال نواب رام پور نے ایک شاہانہ عمارت کی تعمیر کی اور اسی سال ہجری میں ہندوستان کے گورنر بہادر نے نواب کلب علی خاں والی رام پور کو ایک ابلق گھوڑا بھیجا۔ اور نواب رامپور نے منیر شکوہ آبادی کو اسی سال آم بطور تحفہ بھیجے۔ بیگم صاحبہ محل نواب والا جاہ بہادر لکھنوی کی وفات سنہ ۱۲۸۸ھ میں ہوئی۔ نواب رام پور نے رسالہ "ترانہ غم" یعنی نواب کلب علی خاں کا تصنیف کردہ رسالہ جس میں ان کا کلام شائع ہوا۔ سنہ ۱۲۸۸ھ میں شائع کیا۔ سنہ ۱۲۸۹ھ میں مہدی علی خاں کا انتقال ہوا۔ سنہ ۱۲۸۹ھ میں مولانا حضرت سید محمد تقی لکھنوی، جناب نواب والا جاہ بہادر لکھنوی اور مرزا محمد اخباری لکھنوی نے انتقال فرمایا۔ اور اسی سال مولوی فتح علی خاں فرخ آبادی نے بھی وفات پائی۔ سنہ ۱۲۷۳ھ میں نواب رامپور کے فصد کھولی گئی۔ سنہ ۱۲۹۰ھ میں

نواب علی بہادر والی باندہ کی وفات ہوئی اور اسی سال جناب غلامی احسان حسین خان بہادر لکھنوی کا انتقال ہوا۔ سنہ ۱۲۹۱ھ میں منشی منیر کے شاگرد رشید علی عباد بیاں کا جشن عقد منایا گیا۔ منیر کے محسن نواب معین الدولہ باز علی خاں بہادر ظفر جنگ کی وفات سنہ ۱۲۹۱ھ میں ہوئی۔ اسی سال وقار مراد آبادی نے اپنا دیوان ترتیب دیا۔ سنہ ۱۲۹۰ھ میں عمارت جدیدہ کی تعمیر ہوئی سنہ ۱۲۹۱ھ میں نواب واجد علی خاں رضوان کی وفات ہوئی۔ اور سنہ ۱۲۹۰ھ میں عیدگاہ کی تعمیر نواب رامپور کے حکم سے کی گئی۔ سنہ ۱۲۹۱ھ میں لالہ بخی بہادر فتحپوری کے یہاں فرزند کی ولادت ہوئی۔ اس سال نواب رامپور نے کچھ جواہر خریدے جناب تیر صاحب نے کتاب "آرسی مصحف" کی تصنیف سنہ ۱۲۹۱ھ میں کی۔
سنہ ۱۲۹۱ھ میں جناب منشی غلام عباس جنہوں نے منیر کی انڈمان سے واپسی پر الہ آباد میں کافی مدد کی اور اپنا مہمان بنایا تھا، کا انتقال ہوا۔ منیر کے استاد مرزا دبیر مشہور مرثیہ گو کی وفات سنہ ۱۲۹۲ھ میں ہوئی۔ اس سال کلب حسن خاں بہادر مظفر حسین بہادر۔ میر مونس اور آغا ابوالقاسم شیرازی نے دنیا سے رحلت فرمائی نواب رام پور نے سنہ ۱۲۹۲ھ میں جشن چھٹی منایا۔ اسی سال نواب رامپور کو گورنمنٹ سے "اسٹار آف انڈیا" عطا ہوا۔ نواب رامپور نے سنہ ۱۲۹۱ھ میں رسالہ "بادمراد" کی تصنیف کی۔ سنہ ۱۲۹۳ھ میں منشی خوشی رام جنہوں نے تاریخ انڈمان لکھی تھی کا انتقال ہوا۔ اسی سال مولوی سید محمد جعفر صاحب لکھنوی کا انتقال ہوا۔
سنہ ۱۲۹۴ھ میں نواب رام پور کے دیوان کی تصنیف ہوئی "کلام نامہ" کی طباعت اسی سال ہوئی۔ نواب دولہا شمس آبادی کا انتقال سنہ ۱۲۹۴ھ میں ہوا۔

منیر کے قطعات تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بالعموم امراء ورؤسا کی

فرمائش پر تاریخی قطعات لکھتے تھے اور صلے و انعام کی تمنا رکھتے تھے۔ کیونکہ مختلف تاریخی قطعات کے عنوانات سے جن میں صلے و انعام کے تذکرے کیے گئے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ مثلاً نواب صفدر جنگ بہادر کے انتقال پر منیر نے حسب فرمائش مظفر حسین خان بہادر نے جو قطعہ تاریخ لکھا ہے یہ بات صاف و اضح ہو جاتی ہے کہ وہ بالعموم حسب فرمائش امراء و رؤساء کے جو قطعات تاریخ لکھا کرتے تھے وہ مزد و انعام کے توقعات کے ساتھ ہوتے تھے اور اگر کسی موقع پر ان کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا تھا تو ان کو سخت ناگوار گزرتا تھا۔ نواب صفدر جنگ کی وفات پر جو حسب فرمائش نواب مظفر حسین خاں قطعہ تاریخ لکھا گیا تھا اس پر نواب مرحوم کے ورثاء نے جب ان کو کوئی انعام نہیں دیا تو ان کو سخت ناگوار گزرا۔ اور قطعہ تاریخ لکھنے کے تقریباً تیرہ سال بعد جب انھوں نے وہ قطعہ تاریخ اپنے دیوان سوئم میں شامل کیا تو اس حقیقت کا اظہار کر دیا۔

"تاریخہائے مرگ نواب صفدر جنگ بہادر حسب فرمائش جناب مظفر حسین خاں بہادر مگر ورثۂ نواب مرحوم از صلہ این جگر کاوی ہا محروم داشتند۔"

منیر کو تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ کبھی کبھی ایک ہی مصرعے میں ہجری و عیسوی تاریخیں نکالی ہیں۔ مثلاً ایک تاریخ میں لکھتے ہیں ؂

| | |
|---|---|
| مصرع واحد میں دو تاریخیں میں نے نظم کیں | جوہر آئینۂ فکر مسلّم ہے یہی |
| پہلے ہیں سال مسیحی بعد از ان ہجری منیر | ہر بشر غمناک ہو اب کی بڑا غم ہے یہی |
| | ۱۸۶۶ء ۱۲۸۳ھ |

منیرؔ نے تاریخ گوئی میں ہر طریقے سے تاریخ نکالی ہے۔ مثلاً کہیں صوری

معنوی تاریخ کہی ہے تو کہیں تخرجہ سے تاریخ نکالی ہے۔ حرف منقوطہ اور
حرف غیر منقوطہ سے بھی تاریخیں نکالی ہیں۔ بہرکیف منیر کو فنِ تاریخ گوئی
پر عبور حاصل تھا۔

# باب پنجم

## میرؔ اور مثنوی نگاری

مثنوی کی اہمیت ہمارے اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ سمجھی گئی ہے کیونکہ اس میں ردیف اور قافیہ کی ہلکی سی پابندی کے ساتھ مسلسل مضامین کے بیان کرنے کی سہولتیں رہتی ہیں۔ صنف مثنوی زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ اسی لئے تمام مضامین نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ "مقدمہ شعر و شاعری" میں حالی لکھتے ہیں :-

"الغرض جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں ان میں کوئی صنف مسلسل مضامین کے بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔ یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ عرب کی شاعری میں مثنوی کا رواج نہ ہونے یا نہ ہو سکنے کے سبب تاریخ یا قصہ یا اخلاق یا تصوف میں ظاہرا ایک کتاب بھی ایسی نہیں لکھی جا سکی۔ جیسی فارسی میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں لکھی گئی ہیں۔ اس لئے عرب شاہنامہ کو قرآن العجم کہتے ہیں اور اسی لئے مثنوی معنوی کی نسبت "ہست قرآن

در زبانِ پہلوی کہا گیا ہے۔" ۹۹؎

اردو میں عشقیہ مثنویوں کے علاوہ اخلاقی اور تاریخی مثنویاں بھی ملتی ہیں مگر کمی کے ساتھ۔ مثنوی میں جب کبھی کوئی تاریخی واقعہ یا فرضی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں مضمون آفرینی اور بلند پردازی کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی۔ میر نے جب مثنوی "حجاب زناں" لکھی تو انھوں نے سیدھی سادی زبان میں گھریلو زندگی کا نقشہ پیش کر دیا۔ جیسا وہ خود ہی لکھتے ہیں ؎

سیدھی سیدھی زبان ہے اس میں
سادہ سادہ بیان ہے اس میں

مثنوی نگار کے لئے کچھ مخصوص روایات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً اس میں ایک بیت کو دوسری بیت سے ایسا تعلق اور ربط ہونا چاہیئے جیسے زنجیر کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے ہوتا ہے۔ اس لئے جن لوگوں کو غزل گوئی میں مہارت ہوتی ہے وہ اس طرح مختصر گوئی اور رمز نگاری کے عادی ہو جاتے ہیں کہ ایک شعر کا تعلق دوسرے شعر سے ضروری نہیں رہتا اور ہر شعر اپنی جگہ مکمل مضمون یا مفہوم کا حامل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ مثنوی کہنے میں اپنے فرائض کو اچھی طرح انجام نہیں دے سکتے ہیں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ قصہ کی بنیاد ناممکن اور خرق العادۃ باتوں پر نہ رکھی جائے جس کی وجہ سے زندگی کے حقائق سے بے ربطی پیدا ہو جائے اور قصہ کچھ غیر حقیقی معلوم ہو۔

تیسری ضروری بات یہ ہے کہ بیان واقعات و ترتیب خیالات میں زیادہ مبالغہ نہ ہو تاکہ بات بے اثر نہ ہو جائے۔ اور سننے والوں کے دل اس سے پوری طرح

---

۹۹؎ مقدمہ شعر و شاعری از حالی صفحہ ۲۱۴ (تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء)

متاثر ہو سکیں۔ نادر تشبیہات اور دور از کار استعارے عام لوگوں کے ذہن کو متاثر نہیں کیا کرتے اور اصل مطلب تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔

چوتھی ضروری بات مثنوی کے لئے یہ ہے کہ مقتضائے حال کے موافق کلام پیش کیا جائے اور قصہ کو اس طرح آگے بڑھایا جائے کہ کوئی بات خلاف عادت اس میں نہ آنے پائے اور واقعات کی دلچسپی بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے

پانچویں یہ کہ جس معاشرت اور ماحول کا نقشہ پیش کیا جائے وہ الفاظ و معانی کے لحاظ سے نیچرل اور موافق عادت ہو۔

چھٹی بات یہ ہے کہ ایک بیان دوسرے بیان کی تکذیب نہ کرے کیونکہ اس سے قصہ نگار کا پھوہڑپن ثابت ہوتا ہے۔

ساتویں چیز یہ ہے کہ کوئی بات ایسی نہ بیان کی جائے جو تجربے اور مشاہدے کے خلاف ہو۔

آٹھویں بات جو سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ جن واقعات پر قصہ کی بنیاد رکھی جائے ان کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے اور ضمنی باتوں کو رمز و ایما یا اشارہ و کنایہ میں بیان کیا جائے۔

مختصراً یہ کہ مثنوی میں جس داستان یا واقعہ کا بیان کیا جائے اس میں حسن ترتیب کا خاص خیال رکھا جائے اور جن لوگوں کے کردار اس میں پیش کئے جائیں۔ ان کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ کیوں کہ قصے کے ضمن میں سیکڑوں اشخاص کا ذکر آتا ہے اور ان سب کی بول چال طبیعت اخلاق، مزاج وغیرہ مختلف ہوا کرتے ہیں لہذا اس لحاظ سے مثنوی میں ان کو دکھانا ضروری ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا اصول تنقید حالی اور شبلی کی تحریروں سے اخذ کئے گئے ہیں جو

ہمارے لئے منیر شکوہ آبادی کے تنقیدی مطالعہ میں کارآمد ہو سکتے ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں منیر شکوہ آبادی کی مثنویاں کہاں تک پوری اتری ہیں۔

## منیر کی مثنویاں

منیر کی مطبوعہ مثنویاں دو ہیں۔ ایک "حجاب زناں" دوسری "معراج المضامین"۔ پہلی مثنوی اخلاقی و معاشرتی ہے اور دوسری مذہبی رنگ میں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر لاجواب اور بے مثال ہیں۔ علاوہ ازیں منیر کے دیوان اول میں تین مثنویاں اور دیوان سوم میں سات مختصر مثنویاں عرائض کی شکل میں شامل ہیں۔ ان عرضیوں سے منیر کے حالات زندگی جمع کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ پہلے دیوان کی تین عرضیاں نواب علی بہادر والی باندہ کو فرخ آباد سے لکھی گئی ہیں۔ جن میں منیر نے باندہ میں اپنی ملازمت کا اشتیاق ظاہر کیا ہے اور دیوان سوم کی عرضیاں بھی ان کے حالات زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ سب کی تعداد کل گیارہ ہے۔ منیر کے دواوین میں جو بھی مختصر مثنویاں بہ شکل عرائض شامل ہیں۔ ان سے نہ صرف منیر کے حالات زندگی بلکہ اس عہد کے سیاسی و سماجی حالات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ منیر کی مندرجہ بالا دو مثنویاں جو کتابی صورت میں علیحدہ شائع ہو چکی ہیں۔ اپنے عنوانات، موضوعات اور انداز بیان کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ لہذا ان کا کسی قدر تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

## الف۔ مثنوی حجاب زناں

منیر نے اس مثنوی کا نام "ہرمزی خانم" مثنوی کی ہیروئن کے نام پر رکھا ہے۔ شاعر نے یہ کاغذی کھلونا ملک کی لڑکیوں کے لئے پیش کیا ہے کہ کم سنی میں اس کو پڑھ کر جی بہلائیں اور شادی ہو تو ساتھ جہیز میں لے جائیں۔ یہ مثنوی

ایک طرح کا نصیحت نامہ ہے جس میں اس زمانے کی تعلیم و تربیت اور معاشرت کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس مثنوی میں نصیر الدین حیدر[1] کے عہد کی ایک بڑی بی نے اپنی نواسی سے کہانی کے طور پر مختلف مثالوں اور عنوانوں کے ذریعہ ان عورتوں کے حالات بیان کئے ہیں جو اپنی لاپرواہیوں کی بدولت تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں حاصل کرتی بلکہ نقصان اٹھاتی ہیں۔ اس سلسلے میں اس عہد کی معاشرت اور مراسم اور لباس وغیرہ کی کیفیات قلم بند کی ہیں۔ اس طرح سے میر نے اس مثنوی میں اودھ کی معاشرت کی چلتی جاگتی تصویر اور اس عہد کے حالات نہایت خوبی سے پیش کئے ہیں زبان بالکل سادہ و صاف ہے اور ہر شخص یعنی معمولی اردو داں بھی اس کے مطالب کو سمجھ سکتا ہے۔ میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" سے بہ لحاظ زبان یہ مثنوی بہت قریب آتی ہے۔ اس میں قصہ کم اور معاشرت زیادہ ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی حجاب زنان لکھنے کے لئے میر نے جب قلم اٹھایا تو پہلی چیز جو انکے پیش نظر تھی وہ یہ تھی کہ اہل زمانہ ان کی اس نظم سے حسب دل خواہ فائدہ اٹھائیں اور ہماری روزمرہ گھریلو زندگی میں اس کے مطالعہ سے کچھ سدھار اور معاشرتی اصلاح کی صورتیں پیدا ہوں۔ وہ اس مثنوی کا سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کچھ گرہستوں کی فرمائش پر یہ مثنوی لکھی گئی ہے

---

۱؎ نصیر الدین حیدر:۔ غازی الدین حیدر کے بیٹے تھے اور اپنے والد کے بعد ۱۸۲۷ء میں تخت نشین ہوئے اور ۱۸۳۷ء تک حکومت کی۔ وہ شاعر تھے اور بادشاہ تخلص تھا۔ اکثر مصورین کی شان میں اکثر اظہار تاثرات کیا کرتے تھے۔ اور غزلیں بھی کہتے تھے۔ ان کی ایک غزل کا مطلع نظر ہذا پیش ہے۔

یہ کس مست کے آنے کی آرزو ہے     کہ ساقی لئے ساغر مشک بو ہے

اور اس میں انھوں نے وہ طرزِ بیان اختیار کیا ہے جو ان کے دیگر کلام اور انداز بیان سے بالکل مختلف ہے۔ سیدھی سادی زبان میں نہایت سادگی کے ساتھ انھوں نے روزمرہ پیش آنے والے گھریلو مسئلوں کو ایک قصّے کی صورت میں پیش کر دیا ہے اور شاعرانہ نازک خیالیوں اور بلند پروازیوں کے بجائے انھوں نے سادہ نگاری اور افادیت کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں :-

اے قلم پہلے لکھ دے بسم اللہ ۔۔۔ تاکہ نافع یہ سب کو ہو دل خواہ
کچھ گرہستوں کی تھی یہ فرمائش ۔۔۔ ہو تی صفحہ کی اس سے آرائش
حال جو کچھ سنا کیا موزوں ۔۔۔ نہیں اس میں لطافت موزوں
اس میں اکثر نہیں ہیں وہ قیدیں ۔۔۔ جو ہیں میرے قصیدے غزلوں میں
اپنے لہجے میں یہ کلام نہیں ۔۔۔ جب تو اس میں وہ التزام نہیں
سیدھی سیدھی زبان ہے اس میں ۔۔۔ سادہ سادہ بیان ہے اس میں

اس مثنوی میں شاعر نے ہر واقعہ نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ قصّہ مختصراً یوں ہے :-

ایک نانی اماں اپنی نواسی کو نیک عورتوں کے کردار، لباس وضع قطع کا حال بتاتے ہوئے اس عہد کے چشم دید حالات سناتی ہیں کہ لکھنؤ میں ایک لڑکی ہرمزی خانم تھی جو شریف، سلیقہ شعار اور ہنرمند تھی اور امور خانہ داری میں ماہر، بقدر ضرورت تعلیم یافتہ اور سگھڑ تھی اور جس میں اس وقت کی سب خانگی صفات موجود تھیں۔ باپ کا سایہ سر سے بچپن میں ہی اٹھ گیا تھا۔ ماں نے پرورش کی اور اس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق شادی کر دی۔ بدقسمتی سے ساس بہت بڑھی تھیں اور دماغی

خلل میں مبتلا تھیں۔ ہرمزی خانم کے شوہر "اچھے مرزا" جن کی عمر صرف سترہ سال کی تھی۔ ان کو افیون کھانے اور مدک پینے کی شدید عادت تھی۔ گھر کے خرچ کے سلسلے میں سب جہیز بکنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دولہن کی ماں سمدھن کے پاس اپنی لڑکی کی تکلیف سے متاثر ہو کر آئیں اور قدرتی طور پر ان کے دل میں جو جذبات اُبھر سکتے تھے۔ ان کا اظہار سمدھن سے کرنے لگیں اور بات تلخ کلامیوں تک پہنچ گئی۔ صورتِ حال کو بگڑتے دیکھ کر خود ہرمزی خانم نے اپنی ماں کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی اور پوری طرح مطمئن کر کے گھر واپس کر دیا۔ ہرمزی خانم کے اس طرزِ عمل اور سوجھ بوجھ سے ساس بھی اس کی گرویدہ ہو گئیں۔ ہرمزی خانم کا شوہر اپنی ساس کے آنے کی خبر سُن چکا تھا۔ چنانچہ جب وہ گھر آیا تو بہت اُداس تھا۔ بیوی نے خاموشی کی وجہ دریافت کی اور خیال کیا کہ شاید آج افیون اور مدک کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ اپنے زیورات دینے کو کہا مگر اچھے مرزا بہت شرمندہ ہوا اور اس نے نوکری کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ نوکری کی تلاش میں وہ شہر سے باہر نیپال کی طرف چلا گیا۔ زمانے کے رسم و رواج کے مطابق اچھے مرزا سفر پر روانہ ہوئے اور ایک ٹھاکر زمیندار نے ان کی بہت مدد کی اور راؤ دھن سنگھ جو لکھنؤ شہر کا رہنے والا تھا۔ اس وقت ایک گاؤں کا حاکم تھا۔ چنانچہ ٹھاکر زمیندار کے ... بنا دینے پر اچھے مرزا وہاں پہونچ گیا اور وہیں ملازمت کر لی

دوسری طرف ہرمزی خانم کا اپنے شوہر کی جدائی میں بُرا حال تھا۔ کھانا پینا، ہنسنا بولنا، سب ترک کر دیا تھا، ساس برابر سمجھاتی تھیں۔ مگر اس کا دل بہت اُداس رہتا تھا۔

یہ قصہ اس وقت کا ہے جب کہ نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ ہر طرف

خوش حالی تھی۔ ہرمزی خانم کی ماں نے اس کو بادشاہ کی بیگم قدسیہ محل کی کنیزوں میں رکھانے کا انتظام کیا۔ ہرمزی خانم اپنے شوہر کی مرضی معلوم کئے بغیر نوکری پر راضی نہ ہوئیں۔ مگر ماں کے اصرار اور ساس کی تقلید سے مجبور ہو کر بیگم کے محل میں بہ سلسلۂ ملازمت چلی گئیں اور وہیں رہنے لگیں۔ محل کے عیش و آرام میں بھی ہرمزی خانم کو اپنے شوہر کی یاد برابر ستاتی رہتی تھی۔ رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ "میں یہاں آرام سے ہوں اور کیا معلوم میرا شوہر کس حال میں ہو"۔ ہرمزی خانم کی سلیقہ مندی اور ہنرمندی کو دیکھ کر بادشاہ کی بیگم نے ان کو محل کا مختار بنا دیا۔ اور تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہو گئی۔ اس کے علاوہ انعام و اکرام مل جاتے تھے۔ ہرمزی خانم نے جب بادشاہ کی مہربانیاں اور اچھا سلوک دیکھا تو اپنے شوہر کو بلوانے کی بادشاہ سے التجا کی اور اس سلسلے میں بادشاہ سے بتایا کہ وہ (اچھے مرزا) نیپال اور گورکھپور کی طرف گئے ہیں اگر انکو وہاں سے بلوا لیا جائے تو بڑی مہربانی ہوگی۔ بادشاہ اس کے حسنِ خدمات اور التجاؤں سے متاثر ہوا۔ اور اس کے شوہر کو ایک مہینے کے اندر بلوا لیا۔ اچھے مرزا نے بادشاہ کے قدموں میں گر کر شکریہ ادا کیا اور بادشاہ نے خوش ہو کر ان کو اپنے شاہی ملازموں میں شامل کر لیا۔ دونوں میاں بیوی آرام سے رہنے لگے۔

مندرجہ بالا کہانی ختم کر کے پھر بڑی بی اپنی نواسی کو نصیحت کرتی ہیں اور عورتوں کی تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے فائدے بتاتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ عورتوں کو کس طرح زندگی گزارنا چاہیئے۔ چنانچہ اس مثنوی کو پڑھ کر پرانی تہذیب اور معاشرت کا دھندلا سا عکس آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے ظاہر ہے کہ آج کل کی تہذیب اور اس زمانے کی تہذیب میں زمین آسمان کا

زن ہے جیسا کہ ناشر حجاب زناں نے لکھا ہے کہ شادی بیاہ کے رسم و رواج عجیب و غریب نظر آتے ہیں۔ پہلے شادی میں اکثر لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کی صورت سے ناآشنا، مزاج سے ناواقف اور چال چلن سے بے خبر ہوتے تھے۔ نہ تو لڑکے اس شاہراہِ زندگی پر قدم رکھنے سے پہلے آنکھ کھول کر دیکھتے کہ کہیں اندھے کنوئیں میں تو نہیں کود رہے ہیں اور نہ لڑکیوں کو موقع دیا جاتا کہ وہ سوچ لیں کہ عمر بھر کے لئے جس کے پلے پڑنے کو ہیں وہ بھلا ہے یا برا۔ اپنی پرائی عورتوں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے شرمائی ہوئی آنکھیں اور نہوڑائے ہوئے سر سے ایک "ہاں" کا اشارہ ان کی آئندہ قسمت کا فیصلہ کر دیتا تھا۔ خوش قسمتی سے میاں بیوی ایک خیال ہوئے تو ساری زندگی محبت سے گزر جاتی اور اگر بدقسمتی سے دو مخالف طبیعتوں کا سامنا ہو گیا تو تمام زندگی گھر کا نقشہ دوزخ بن جاتا تھا۔ مگر آج کل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ساتھ ہی پہلے اگر طبیعت برعکس بھی ہوئی تو حسن تربیت اور مذہب و اخلاق کا اثر ایسا ہوتا تھا کہ عورتیں اختلاف طبیعت کے باوجود شوہر کی سچی وفاداری اور خدمت گزاری میں دوسرے ملکوں سے پیچھے نہیں بلکہ بہت آگے رہتی تھیں۔ آجکل کی طرح نہیں ہوتا تھا کہ میاں کی کج روی تساہل اور بیکاری سے تنگ آکر قانونی کارروائی کرنے لگیں یا دامن جھاڑ کر الگ ہو جائیں بلکہ شوہر کو راہِ راست پر لانے کی امکانی کوشش کرتیں اور قدرت ان کو کامیابی بھی دیتی۔

مندرجہ بالا معاشرت کا نقشہ اس مثنوی میں پیش کیا ہے کہ کس طرح "ہرمزی خانم" (ہیروئن حجاب زناں) نے اپنے شوہر کے لئے قربانی پیش کی اور آخر میں دونوں کی زندگی خوش حالی سے گزرنے لگی یہ اس زمانے کی

اچھی تعلیم ہی کا نتیجہ تھا۔ ایک وقت آتا ہے۔ جبکہ اس کا شوہر (اچھے مرزا) خود شرمندہ ہو جاتا ہے۔ اس کو یوں فرماتے ہیں:-

اچھے مرزا نے تب کیا یہ کلام — تم سے راحت ہے تم سے ہے آرام
کس کو ملتی ہے ایسی بیوی نیک — پارسا بیویوں میں ہو تم ایک
زیور و زر نہیں ہے مجھ سے عزیز — میں غلام اور میری ماں ہے کنیز
کرتی ہو ہر طرح مری خاطر — خرچ سب گھر کا ہے تمہارے سر
ایک کوڑی کبھی نہ میں لایا — تم کو اس پر بھی خوش سدا پایا
مجھ کو انیوں نے کیا عاجز — کوئی خدمت نہ ہو سکی ہرگز
تم سے شرمندگی ہے مجھ کو کمال — دل میں میرے بندھا ہوا اور خیال

قصہ روزانہ زندگی سے متعلق ہے اور اس میں ایک معیاری شوہر اور معیاری بیوی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قصہ اس طرح آگے بڑھتا ہے کہ پڑھنے والوں کی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے اور آہستہ آہستہ روزمرہ کی زندگی کے پیش آنے والے واقعات کی مدد سے اصلاح معاشرت کا سامان مہیا کر دیا جاتا ہے اور مثنویوں میں جو بعض اوقات مبتذل اور غیر مہذب بیانات یا مناظر آجایا کرتے ہیں۔ ان سے یک قلم پہلو تہی کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں امیر احمد علوی لکھتے ہیں:-

"آخر کے دو چار شعر جو میلے ٹھیلوں میں جانے والی عورتوں کی مذمت میں لکھے ہیں۔ حذف کر دیے جائیں تو یہ نظم اس قابل ہے کہ لڑکیوں کے درس میں مقرر کی جائے اور زمانہ حال کی روشن خیال خواتین اس نصیحت نامہ سے فائدہ اٹھائیں۔" [سلہ]

مثنوی کے لیے جن لوازم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کو میر نے بخوبی نبھایا ہے

---

[سلہ] "مثنویات" مصنف امیر احمد علوی۔ صفحہ ۱۱

ان کی مثنوی میں زبان کی سادگی اور متانتِ بیان کے ساتھ درد و تاثیر بھی ہے۔ مختصراً اس مثنوی میں حسب ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ واقعہ نگاری
۲۔ معاصرانہ عہد کی زندگی اور اس کی عکاسی
۳۔ مکالمہ نگاری
۴۔ سادگی و سلاست
۵۔ الفاظ کا برمحل صرف روزمرہ اور محاورہ۔
۶۔ جذبات نگاری

**۱۔ واقعہ نگاری** میر کو واقعہ نگاری میں کمال حاصل ہے۔ جس بات کا ذکر کرتے ہیں اس کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ آنکھوں میں بالکل تصویر پھر جاتی ہے۔ مثلاً انھوں نے اس مثنوی میں لکھنؤ کی خوش حالی، وہاں کی عزاداری اور تباہی و بربادی کا حال، گرمی کی تکلیف اور جنگل کی ویرانی کا بیان جب شوہر (اچھے مرزا) نوکری کی تلاش میں جاتا ہے تو ہرمزی خانم کی ہجر کی مصیبت کی کیفیت، گاؤں اور شہر کے لوگوں کا فرق اور گھریلو زندگی کا نقشہ نہایت موثر اور لاجواب طریقہ سے پیش کرتے ہیں مثلاً :-

لکھنؤ کے متعلق لکھتے ہیں ؎

لکھنؤ کا جو شہر ہے مشہور — اب ہے ویران پہلے تھا معمور
کبھی اس شہر کا یہ تھا عالم — ڈھونڈھے ملتا نہ تھا کسی کو غم
سب وہاں تھے خوشی کے عالم میں — غم جو تھا بھی تو تھا محرم میں
شادی ارزاں تھی عیش سستا تھا — رات دن حسن وہاں برستا تھا
ہاتھ خالی بھی جو وہاں آتے — لکھنؤ سے بھرے پُرے جاتے

مٹ گئی سلطنت وہاں کی جب　　اُڑ گیا چین عیش سب کا سب
کھاتے تھے جو ہزاروں کو دے کر　　پھرتے ہیں ٹکڑے مانگتے گھر گھر

لکھنؤ سے نیپال جانے میں "اچھے مرزا" کو جن جنگلوں سے سفر کرنا پڑا۔ انکی ویرانی اور گرمی کی تکلیف کا حال منیرؔ اس طرح بیان کرتے ہیں:-

فصل گرمی کی اور وہ جنگل　　دھوپ کے مارے ہو گیا بے کل
ہر طرف تھا غضب کا سناٹا　　بن پڑا سائیں سائیں کرتا تھا
چلتی تھی لو، زمین تپتی تھی　　روح گھبراتی تھی تڑپتی تھی
دونوں تلوؤں میں پڑ گئے چھالے　　کانٹے چبھتے تھے جس طرح بھالے
سوج کر پاؤں ہو گئے بھاری　　پیاس کے مارے جان تھی عاری
گرم لو تن کو پھونکے دیتی تھی　　بھاڑ کی طرح گرم رہتی تھی
گڑتے تھے اسکی جان میں کانٹے　　پڑ گئے تھے زبان میں کانٹے
ہونٹھ پپڑا گئے آ چلی ہچکی　　حلق سے تھی زبان پر خشکی
گڑھے آنکھوں میں منھ کی رنگت زرد　　گرم گرم اڑکے پڑ رہی تھی گرد
طلب سایہ گاہ کرتا تھا　　کبھی پانی کی چاہ کرتا تھا
طلب آب میں یہ تھا بے ہوش　　پاؤں کے آبلے تھے شکر بدوش
اس بیاباں میں درخت نہ چھاؤں　　دوڑتے دوڑتے موٹے ہو گئے پاؤں
کہیں اڑتا ہوا بگولا تھا　　کسی جانب مدار پھولا تھا
تھا بھی تو تھا کریل کا جنگل　　جس میں کریل نہ پتی پھول نہ پھل
راہ کانٹوں نے ہر طرف گھیری　　سوکھی سوکھی لگی تھی جھربیری
دل کڑی دھوپ میں ہوا ٹھنڈا　　چیل کی بھی چھوڑنے لگی انڈا
جھاڑ کانٹوں کے تھے ببول کہیں　　کوئی پتا نہ جس میں پھول کہیں

اچھے مرزا کے تلاش معاش میں نکل جانے کے بعد ہرمزی خانم کی ہجر نصیبی کا حال منیر اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

جب سے دولہا جدا ہوا اس کا　　جلنے سے دل خفا ہوا اس کا
کوئی کھانا اسے نہ بھاتا تھا　　بات کرنا بھی خوش نہ آتا تھا
مسّی مہندی بھی ترک کی اس نے　　کنگھی چوٹی بھی چھوڑ دی اس نے
ہنس کے بولے کسی سے کیا ممکن　　نہ بدلتی تھی کپڑے دن دن دن
رنگ چہرے کا زرد آنکھیں لال　　میلے کپڑے بکھرے سر کے بال

شہر والوں کی ظاہر داری اور گاؤں والوں کے خلوص کا نقشہ منیر اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

تنگدل گو کہ اب کی خلقت ہے　　پر زمیندار دل میں مروت ہے
ان میں اب بھی بہت ہیں نیک نہاد　　بھوکے ٹوٹے کی کرتے ہیں امداد
ہر مسافر کی لیتے ہیں وہ خبر　　رکھتے ہیں مہمان اپنے گھر
نوح ہوئے مروّت ایسی　　شہر والوں میں ہوتی تھی جیسی
چکنے چپڑے ہیں اور خوش پوشاک　　دل میں دیکھو تو اڑ رہی ہے خاک
منھ تو چکنا ہے پیٹ خالی ہے　　پر زبانی مزاج عالی ہے
اس سخن سے نہیں ہے یہ مطلب　　کہ ہیں بد وضع شہر والے سب
یا کہ ہیں گاؤں والے سب بہتر　　بحث اس کا بتاؤں میں کھل کر
گاؤں والوں کا ہے جو ظاہر حال　　سیدھی سادی ہے جس طرح کی چال
دخل اس میں ہے کم بناوٹ کا　　میل تھوڑا ہی ہے لگاوٹ کا
وہ برائی اگر کسی سے کریں　　لوگ اتنا نہ ان کو نام دھریں
شہر کے لوگ ملتے ہیں جھک کر　　گرم جوشی ہے سب سے بالا تر

میٹھی میٹھی ہیں خوش نما باتیں  ہیں شکر پاروں سے سوا باتیں

گھریلو زندگی کا نقشہ :-

سلیقہ داری جو بیبیاں ہیں نیک  چال ان کی ہر ایک بات ہے ایک
کام خوف خدا سے ہے ان کو  ربط شرم و حیا سے ہے ان کو
نہیں ہوتی ہیں بے لحاظ کبھی  پردہ ان کو ہے باپ بھائی سے بھی
روکھی سوکھی جو پائیں کھاتی ہیں  جو مصیبت پڑے اٹھاتی ہیں
جس سے بگڑے گرو ہوں یار تن  بھاڑ میں جائے وہ چھچھورا پن
ایسے تن پیٹ کے مزے پہ خاک  جس سے کٹ جائے سات پشت کی ناک
گھر کے نزدیک نکلے کوئی برات  جھانکتی ہی نہیں وہ دن ہو کہ رات
نہیں قصے کہانیوں سے کام  نوج پڑھ کر وہ اگر ہوں بدنام

## ۲- معاصرانہ عہد کی زندگی اور اس کی عکاسی

معاصرانہ عہد کی عکاسی کے سلسلے میں کہہ سکتے ہیں کہ میر نے اس وقت کے طرز معاشرت پر نہایت خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ جس سے شاعر کا مخصوص انداز بیان اور ہمہ دانی اور معلومات کی داد دینا پڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جزئیات کا شاہد اور عمیق نگاہی ان کی خصوصیات تھیں۔ مثلاً ہر فرزی خانم کی شادی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

جب سلامی کی ہو چکی باری  آئی در کے قریب اسواری[۱]
بیٹھ سکھپال میں سوار دولہن  روتی جاتی تھی زار زار دولہن
بھر گئی ساتھیوں سے راہ گلی  باجے بجنے لگے برات چلی

---

۱- اس وقت کی مخصوص سواری کا نام ہے۔

خوش نما تھا جہیز کا جانا　　ڈولیوں میں بہوڑے[۱] کا کھانا

کچھ مختلف اشعار جن سے مخصوص باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ملاحظہ ہوں:-

بیٹی چھوٹی نویسی کی تھی　　مرثیہ خوانی اس نے سیکھی تھی
نئی مشاطہ روز آتی تھی　　بات اونچے گھروں سے لاتی تھی
شرع کی حد سے کب وہ بڑھتی ہیں　　مسئلوں کی کتابیں پڑھتی ہیں
دائی، چھوچھو، دوائیں، آنائیں　　لونڈیاں اور اصیلیں مامائیں
رو رہی تھی دولہن گلے مل کر　　جا رہا تھا جہیز سب باہر
چاندی کا اک پلنگ خوش ترکیب　　کارچوبی پلنگ پوش عجیب
تکیہ چادر لحاف عطر آگیں　　ڈوریاں اور تیچے کی بھی زریں
بھاری جوڑے بہت نئے پُر زر　　پاؤں تک سر سے گہنے کا زیور
چوگھڑا پاندان تھالی جوڑ　　چاندی کے حسن دان بھی کئی جوڑ
خاصدان اور گڑگڑی خوش قطع　　خوش نما تھی اُگالدان کی وضع
اک چھپرکھٹ جہیز کا نایاب　　بس یہ چاندی کا تھا تمام اسباب
تکیہ مسند دوشالہ گلنار　　دی سلامی بھی خوب چلتے کلدار
چاندی کے ساز سے دیا گھوڑا　　تحفہ سمدھن کے واسطے جوڑا
تانبے اور جستے کے بہت برتن　　آیا اٹھ اٹھ کے تکتی تھی سمدھن

**۳۔ مکالمہ نگاری** | مکالمہ میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جس شخص سے جو بات کہلوائی جائے۔ وہ اس کی طبیعت اور مزاج، جنس اور مرتبہ، عمر، شخصیت، حیثیت سے مطابقت رکھتی ہو اور موقع و محل کے لحاظ سے مناسب۔ میر کی اس مثنوی میں قصہ کا

---

[۱] وہ کھانا جو دولہن والے برات کو رخصت کرتے وقت ان کے ساتھ بھیجتے ہیں۔

ارتقاء بالعموم ان کے کرداروں کے مکالمے یا بات چیت سے ہوتا ہے۔ مثلاً محل کی ایک عورت کے لئے لکھتے ہیں:۔

ماش کے آٹے کی طرح سے بڑا  خود بخود اٹھی جاتی تھی جوڑا

دیگر اشعار جو مکالمہ کی بہترین مثالیں ہیں ملاحظہ ہوں:۔

بولی داماد سے یہ رو کر ساس  داری دولت نہیں ہے میرے پاس
اپنی بچی کا رنج سہتی ہوں  جوڑ کر ہاتھ تم سے کہتی ہوں
نازوں کی پالی ہے مری پیاری  تو نہ نادان تہ اس کا بس واری
نہیں کرنے کی یہ تمہارے تحلات  بد مزاجی سے تم بھی رکھیو معاف
خوب معلوم ہے زمانے کو  لونڈی بیٹی ہوں منہ دھلانے کو
ساس کے آگے شرم سے دولہا  باندھ کر ہاتھ اس طرح بولا
میری مالک ہیں یہ مری مختار  ہوں میں ان کا غلام تا بیدار
جس طرح چاہیں مجھ سے پیش آئیں  جوتیاں میری کھال کی بنوائیں
ساس نے لیں بلائیں خوش ہوکر  بولی بیٹا نثار میں تم پر

## ۴۔ سادگی و سلاست

جہاں تک سادگی اور سلاست کا تعلق ہے تو خود میر نے لکھ دیا ہے:

حال جو کچھ سنا کیا موزوں  نہیں اس میں لطافت مضموں
اس میں اکثر نہیں ہیں وہ قیدیں  جو ہیں میرے قصیدے غزلوں میں
سیدھی سیدھی زبان ہے اس میں  سادہ سادہ بیان ہے اس میں

اس مثنوی میں زبان کی سادگی اور متانت بیان کے ساتھ درد و تاثیر بھی ہے میر نے سیدھی سادھی زبان میں اور موقع و محل کا لحاظ کرتے ہوئے قصہ کو بیان کیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ناحق اس وقت سر پھراتی ہو　　بڈھی جورو کو کیوں ستاتی ہو
اے تو تم تو اداس ہونے لگیں　　روٹھ کر چپکے چپکے رونے لگیں
کر کے آداب سب کو نہوڑا کر　　بیٹھو بیگم کے روبرو جاکر

## ۵- الفاظ کا برمحل صرف، روزمرہ اور محاورہ

میر نے الفاظ کا بہت برمحل استعمال کیا ہے۔ اور اکثر و بیشتر محاوروں کے استعمال سے شعروں کی خوبی کو دوبالا کر دیا ہے۔ اور لکھنؤ کی ان روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے جو زبان و بیان اور انتخاب الفاظ کے سلسلے میں ہمیشہ دبستان لکھنؤ کی خصوصیت رہی ہیں۔ میر نے مروجہ زبان کا بہت لحاظ رکھا ہے اور موقع و محل کے لحاظ سے زبان کا استعمال کیا ہے مثلاً:-

موئی عورت تو سیکھے علم و ہنر　　بیل ہو جائے مردوا ہو کر
پر نکھٹو وہ مردوا ہے کمال　　بے حیا بن کے پائے جو کچھ مال
ہر گھڑی ماں تھی باغ باغ اسکی　　تھیں دسوں انگلیاں چراغ اسکی
پہنچی مفلس دولہن نے جب سسرال　　ہو گیا غم سے اس کا پتلا حال
رنج ایسا اٹھاؤں گی کیوں کر　　ماں کا دل ہے نہیں کوئی پتھر
ہر کوئی آ تو جی کو سیکنے لگی　　کھچڑی سارے محل میں پکنے لگی
جس نکھٹو نے پیٹ دولن پالا　　دونوں عالم میں اسکا منھ کالا
سچ ہے یہ سن تو مجھ سے اس کا بھید　　کرتی ہیں وہ بھی لاکھ پردوں میں چھید
دل کڑی دھوپ میں ہوا ٹھنڈا　　چیل بھی چھوڑنے لگی انڈا

اس مثنوی کی سیدھی سادی زبان دیکھ کر میر کی قادر الکلامی کی داد دینا پڑتی ہے۔ اگرچہ انھوں نے ایک طرف قصیدہ اور غزل میں مشکل زمینوں پر طبع آزمائی کی گئی ہے اور مولانا حالی کے اس اعتراض کی ان کے کلام پر گنجائش

نہیں رہتی کہ غزل لکھنے والا مثنوی کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا اور "پتیلی پکانے والا دیگ اچھی نہیں پکا سکتا"۔ میر نے اس مثنوی میں واقعہ نگاری اور بے تکلف حقائق بیانی کی طرف اشارہ کرکے پرانی معاشرت کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ زمانہ ماضی کی معاشرت کے اصول کے مطابق کمانے اور باہر کام کرنے کی ذمہ داریاں مرد کے سر ہوں اور گھر کی دیکھ بھال عورتوں کے ذمہ رہے۔ مگر نئے تہذیبی اصول کہ جن میں عورتوں اور مردوں کو برابر سمجھا گیا ہے۔ میر کو ایک آنکھ نہیں بھاتا ہے۔ وہ وہی اپنی قدیم معاشرت کے دلدادہ ہیں کہ جن میں انتظامی ذمہ داریاں مردوں کی ہیں اور اندرون خانہ ذمہ داریاں عورتوں کی۔ چنانچہ میر نے اپنے دلی جذبات کو اس مثنوی میں پیش کر دیا ہے۔ اور ہر بات بہت بے تکلف انداز میں کہی ہے ان کی زبان، مروجہ لباس، زنانہ فطرت کے مطابق عادات اور انکی اچھائیاں اور برائیاں سبھی پر روشنی ڈالی ہے۔

اردو کی بیانیہ مثنویوں میں اپنی مختصر نگاری اور موضوع کی ندرت کے لحاظ سے میر کی یہ مثنوی کافی دلچسپ ہے اور بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں ایک غریب لڑکی کی شریفانہ زندگی اور اس کی فطری صلاحیتوں کی اور طبعی جوہروں کی ہونہار تصویر میر نے کھینچی ہے۔ جس کی تعریف نہیں ہو سکتی ہے۔ اس میں طبقہ نسواں کی تعلیم کی اہمیت اور پردے کی ضرورت پر نہایت موثر الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس طرح سے متوسط گھرانوں کی معاشرتی زندگی کو ہمارے سامنے ہمیشہ کے لئے غیر فانی بنا کر محفوظ کر دیا ہے اور آج بھی ہم بلا تکلف ہر فرد کی نام میں اب تقریباً سوا سو سال پہلے کی زندگی کو بہت واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں اور اس عہد کی تہذیبی معاشرتی قدروں کو پوری طرح جان سکتے ہیں۔

اس مثنوی کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ میر لڑکیوں کو علم کی طرف مائل کرنا

اور ان کو ہنرمند اور سلیقہ شعار بنانا چاہتے تھے اور تمام خاندانوں کے دلوں میں علم و ہنر کی اہمیت بٹھانا چاہتے تھے۔ جس عہد میں یہ مثنوی لکھی گئی تھی اس وقت کی غزلوں، واسوختوں، ریختی اور عشقیہ مثنویوں کے مطالعہ سے یہ شبہ ہونے لگتا تھا کہ اس عہد میں اخلاقی قدریں بالکل مٹ چکی تھیں۔ مگر اس مثنوی کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ راکھ کے ڈھیر میں پھر بھی کچھ چنگاریاں دبی ہوئی تھیں اور وہ کبھی کبھی ابھر آتی ہیں اور زندگی کو نئی روشنی دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

**(ب) معراج المضامین** یہ طویل مذہبی مثنوی ہے جس میں حضرات ائمہ علیہم السلام کے حالات و معجزات منظوم ہیں۔ اس مثنوی کے متعلق خود منیر کا دعوا ہے ؎

خدا کے فضل سے اردو زباں میں　　جواب اس کا نہیں ہندوستاں میں

یہ مثنوی کب لکھنا شروع کی گئی؟ کتنے دنوں میں لکھی گئی اور کب اہل علم کے لئے پیش کی گئی۔ اس کے متعلق خود منیر کا بیان مثنوی میں موجود ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مثنوی کو ماہ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ میں لکھنا شروع کیا اور سات ماہ میں مکمل کر لیا لیکن جو تاریخی نام اس مثنوی کے منیر نے نکالے ہیں۔ ان سے تصنیف ۱۲۸۶ھ متعین ہوتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ میں منیر نے مثنوی لکھنا شروع کی اور ماہ شوال ۱۲۸۵ھ تک اس کو مکمل کر دیا۔ لیکن منیر نے چونکہ طبیعت نقادانہ پائی تھی۔ اس وجہ سے اس پر نظر ثانی اور مزید چھان بین کے سلسلہ میں کچھ وقت صرف ہوا۔ اور ۱۲۸۶ھ اس کا سنہ تصنیف متعین کیا گیا اس سلسلے میں منیر کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اب آگے سال ہجری سے ہوں مرقوم　　ہزار و دو صد و ہشتاد و پنجم
مہ تصنیف کا بھی چاہیئے ذکر　　ربیع الاولیں ہے بعد فکر
بتا دوں مدت تصنیف بھی راست　　کہی جتنے دنوں میں بے کم و کاست

خدا شاہد کہ باطل یہ نہیں حرف — ہوئے ہیں ہفت ماہ اس میں فقط صرف
ہے ان میں ایک تو نظم منور — پھر اخبار امامت اس سے بہتر
سنہ ۱۲۸۶ھ — سنہ ۱۲۸۶ھ

کہا ہاتف نے اب یوں بعد تحسین — کہ نام اس کا ہو معراج المضامین

منیر نے اس مثنوی کے تین تاریخی نام تجویز کئے۔ نظم منور۔ اخبار امامت اور معراج المضامین۔ جن میں معراج المضامین سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ اور اسی نام سے یہ مثنوی آج بھی مشہور ہے۔ پہلی بار یہ مثنوی ۹ ذی الحجہ سنہ ۱۲۹۱ھ میں منیر کی حیات میں چھپی اور دوبارہ سنہ ۱۳۱۲ھ بماہ ذیقعدہ بمقام لکھنؤ جوہری محلہ میں باہتمام داروغہ مجتہد العصر سید محمد حسین مطبع گلشن باقری میں چھپی تھی۔ اس مثنوی میں دو ہزار ایک سو چھیاسٹھ اشعار ہیں) اور یہ دو سو کے صفحات پر مشتمل ہے۔

## سبب تصنیف اور مختصر جائزہ

اس مثنوی کو لکھنے کا خیال منیر کے دل میں کس طرح پیدا ہوا اور کن لوگوں کی صحبت یا ہمت افزائی نے انڈمان سے واپسی پر ان کو اس ادبی کام پر مستعد کیا۔ اس کی بہت کچھ تفصیلات مثنوی میں مل جاتی ہیں۔ خود منیر اس مثنوی کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جب سے الٰہ آباد میں آیا ہوں طبیعت بجھی بجھی سی رہتی ہے اور خاموشی اور سکوت کی طرف مائل ہے دن رات علمی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں گزرتی ہے اور یہی میرا مشغلہ ہے۔ اسی زمانے میں ایک دن چند مخلص احباب کی محفل میں غازی پور کے رہنے والے الطاف حسین صاحب نے مجھ کو فکر سخن میں مصروف اور قصیدہ گوئی سے مالوف دیکھ کر میری مذہبی قصیدہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے

تجویز کیا کہ ائمہ اکرام کے مختلف فضائل اور معجزات جو مختلف قصائد میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر یکجا کر دیے جائیں اور ساتھ ہی عام فہم زبان میں مختصراً ان مطالب کو بیان کر دیا جائے تو بہت اچھا ہو۔ ان کا خیال تھا کہ قصیدہ نگاری کے جو آداب اور اس کی مشکلات ہیں اس کے مقابلہ میں مثنوی نگاری کا طریقہ آسان تر اور بہتر رہے گا۔ نہ بہت زیادہ رنگین بیانی، مشکل نگاری اور زور تخیل کی ضرورت ہوگی اور نہ قافیہ ردیف کی پابندیاں جتنی قصائد اور غزلیات میں ضروری ہوتی ہیں پرواز فکر کے لئے رکاوٹ کا کام کریں گی۔ منیر کو الطاف حسین غازی پوری کا یہ مشورہ بہت پسند آیا اور موضوع کی ندرت اور مذہبی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے فضائل ائمہ کو مثنوی کی شکل میں یکجا کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اب انھیں حالات کو منیر کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

الہ آباد میں جب سے ہوا ہوں وارد — برنگ یخ ہوئی ہے طبع بارد
سکوتِ نام سے ہے گرم جوشی — نہیں ہے ہم سخن غیر از خموشی
کتابوں کا ہوں میں محوِ تماشا — احادیث و کلام و نظم و انشاء
ہوئے تھے جمع اک دن چند احباب — گلستانِ وفا کے نخلِ شاداب
تعلق میں یار بیماری میں ہمدرد — خریدار طلائی چہرۂ زرد
خیابانِ محبت کی طراوت — مذاقِ آشنائی کی حلاوت
خصوصاً رازِ دلجوئی کے محرم — کہ الطافِ حسین ان پر ہے ہر دم
گلِ بستانِ غازی پور ہیں وہ — ثنائے خلق میں مشہور ہیں وہ
انھوں نے فکر میں مصروف پایا — قصیدہ سے مجھے مالوف پایا
کہا مجھ سے قصائد میں نئی مدح — جداگانہ ہر اک معصوم کی مدح
اگر ہے آپ کو منظور خاطر — اسے لازم ہے اطمینان خاطر

اسے درکار ہے مہلت بہت سی | طبیعت چاق ہو فرصت بہت سی
بہت مشکل ہے باغِ مدح کی سیر | حوادث ہیں ہزاروں مانع الخیر
ثنائے پنجتن میں تم مکرّر | قصائد کہہ چکے بہتر سے بہتر
سخندانانِ اردو کو ہے معلوم | کہ بعد حضرتِ سودائے مرحوم
قصائد بے نظیر ایسے ابھی تک | نہیں موزوں ہوئے اصلاً ہنوز تک
مناسب آپ کو اب ہے یہ تدبیر | کہ لکھا ہو فضائل سب کے تحریر
کچھ اعجازِ ائمہ بھی ہوں موزوں | مناسب معنی و الفاظ و مضموں
مطالب کو نہ دینا طول زنہار | کہ استکشاف ہو لوگوں کو دشوار
ہنر رنگینیِ اخلاق میں کد | کہ فہمِ عام سے ہو جائے ابعد
نہیں ہو لطف اطنابِ مُمل میں | الجھا ہے ذم ایجازِ مخل میں
قصائد کے لئے دقت ہے موضوع | طریقِ شاعری میں ہے یہ مشروع
تم ان میں کر چکے نازک خیالی | دکھا دی قدرتِ مضمونِ عالی
کرو اب مثنوی میں صرف ہمت | کہ ہیں مشتاق اربابِ متانت
پسند آیا مجھے ان کا اشارہ | قدم اس راہ میں یہ کہہ کے مارا
دل اپنا عشق کے دریا میں ڈالا | توکلت علی اللہ تعالیٰ

## ۲۔ مآخذ مثنوی

اس مثنوی کے لکھنے میں میر نے کہاں کہاں سے مواد جمع کیا اور اس کی ترتیب دینے اور تدوین کرنے میں کتنی محنت کی۔ اس کا اندازہ میر کے مندرجہ ذیل اشعار سے کیا جا سکتا ہے

بتاؤں حال مآخذ کا سراپا | کتابیں جو کہ ہیں منقول علینا
شہادت کا ریاض ان میں ہے اشہر | روایات اس سے کی ہیں نظم اکثر
نہیں آسان اصلا اس کا اعلام | صحیح آتا نہیں اس بحر میں نام

درست آنے کا جب پایا نہ اسلوب — تو کی الفاظ کی ترکیب مقلوب
نہ نکلا نام کسے آنے کا جب کام — تو نا چار ان کتابوں کے لکھے نام
کہ جن سے ان میں ہیں منقول اخبار — سر یہ معجزہ ہے اس کا اظہار
مجالس کا ہے تحفہ اور اسے ذل — صحیح اسکا بھی نام آنا ہے مشکل
روایت میں نے اس سے لی ہے کمتر — نہیں وہ چار سے شاید کہ بڑھ کر
رہی تاریخ سیلا دو شہادت — سن احوال اس کا بے نقص و زیادت
کیا ہے جس کتاب خاص سے نقل — زبان خامۂ اخلاص سے نقل
پتا حق حق یہ اس کے نام کا ہے — خلاصہ شرح کے احکام کا ہے
چھپا ہے اس کے آخر میں نقشہ — کہ ہے حال ائمہ اس سے پیدا

گویا منیر نے ان تمام مذہبی روایات اور معجزات کو اس مثنوی میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو مختلف آئمہ کرام کے متعلق مختلف مذہبی کتابوں بالخصوص ریاض شہادت۔ تحفہ مجالس اور خلاصہ احکام شرع میں ملتے ہیں اور ان سے سب روایات کو ایک دوسرے سے ربط دے کر ایک مسلسل مثنوی اور دل چسپ تصنیف بنانے کی کوشش کی ہے۔ منیر نے جس انداز سے مثنوی کو شروع کیا ہے۔ وہ وہی پرانا اور قدیم انداز ہے کہ جس میں ہمیں مختلف اساتذہ کی مثنویاں ملتی ہیں۔ یعنی حمد، نعت اور منقبت کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ اور بارہ اماموں کی تعریف، ان کی ولادت، وفات اور معجزات کا تذکرہ بہت تفصیل، عقیدت اور شاعرانہ رنگ آمیزیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور بیان واقعات میں پوری احتیاط سے کام لیتے ہوئے صرف انہیں باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو مختلف حدیثوں اور مذہبی کتابوں میں مختلف علماء اور بزرگان دین بیان کر چکے ہیں اور جو سلسلہ بہ سلسلہ مختلف کتابوں کی

مدد سے ان تک پہنچتی ہیں۔ وہ اپنی طرف سے نہ تو کسی حدیث میں اضافہ کرتے ہیں اور نہ کسی روایت کو بیان کرنے میں کسی قسم کی کمی کو جائز رکھتے ہیں۔ وہ مختلف حکایات بھی اس ضمن میں بیان کرتے ہیں اور ایک مثنوی نگار کی حیثیت سے اس بات کو اپنے فرائض میں شمار کرتے ہیں کہ وہ تمام باتیں جو اب تک نثر یا نظم یا زبانی حکایات کی شکل میں تھیں۔ ان کو ایک عقیدت مند اور عاشق دوازدہ امام کی حیثیت سے اپنی مثنوی میں محفوظ کر دیں۔ تاکہ آنے والی نسلیں اس سے مستفیض ہو سکیں۔

اس مثنوی میں منیر نے اپنی پیدائش کی تاریخ، اپنے آبا و اجداد کا حال، اپنا نام اپنی زندگی کے دیگر حالات، اپنی تعلیم اور اپنے استادوں، شاگردوں کے حالات بھی تفصیل سے بیان کئے ہیں جس سے ان کی سوانح حیات لکھنے میں کافی مدد ملی ہے اور جس کے باب اول میں جگہ جگہ حوالے بھی پیش کئے گئے ہیں۔

## مثنوی نگاری میں منیر کا مقام

مذہبی مثنوی کے لحاظ سے منیر شکوہ آبادی کی مثنوی معراج المضامین غیر معمولی اہمیت اور دل کشی کی حامل ہے اور شاعرانہ فکر و فن کا کمال بھی اس مثنوی میں بدرجہ اتم ملتا ہے۔ اس مثنوی کی غیر معمولی خوبیوں اور خصوصیت کے متعلق ان کا خود دعویٰ ہے کہ ان کی یہ مثنوی نادر الوجود ہے اور کوئی دوسری مثنوی اس کے مدمقابل نہیں قرار دی جا سکتی۔ اس مثنوی نے ان کی عزت و احترام میں غیر معمولی اضافہ کر دئے ہیں اور اس طرح ان کے اندر احساس برتری پیدا کرنے میں معین اور مددگار ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

زہے فضل خدائے بندہ پرور — کہ مجھ سے ختم کروایا یہ دفتر
عجب لکھوا دیا یہ نقش جاوید — کئے ذرہ سے پیدا اپنے خورشید
نصیحوں کو کیا الکن سے بہوت — اوگلوائے خزف پارہ سے یاقوت

شکستہ شاخ سے طوبیٰ نکالا | زمینِ خشک سے دریا نکالا
بڑھا دی مجھ سے ناقابل کی یہ قدر | کہ تھا داغِ کدورت بن گیا بدر
یہ لقمہ تھا مرے منہ سے زیادہ | بنا نقشِ قدم زیبِ وسادہ
ہوا قطرہ سے گوہر بلکہ نیساں | خس لاشے سے جنت بلکہ رضواں
گدا کو دے دیا جمشید کا تاج | سرِ پامال کو دستارِ معراج
مجھے اس مثنوی سے دی یہ توقیر | کہ سکہ ہو گیا میرا جہانگیر
نہیں تو تھا غنی کیسے مجھ بیاں میں | کہاں مدحت آئمہ کی کہاں میں
یہ صدقہ ہے ائمہ کی ثنا کا | کرم ہے اس وسیلہ سے خدا کا

مثنوی کے خاتمہ پر لکھتے ہیں:-

ہر ایک جا وصف ہر معصوم کا ہے | نمونہ قدرتِ قیوم کا ہے
وہ سمجھے نکتہ سنجوں میں جو ہو اہل | کہ یہ توسیع مشکل ہو نہیں سہل
فضائل میں ہو یکساں چار دہ نور | مناقب پھر جدا ہوں سب کے مذکور
دکھا دے کوئی ہو جس مثنوی میں | زبانِ ہند میں یا فارسی میں
نہیں پھر اس میں ثانی نامے بھی کم | ہر اک تمہید میں ہے اور عالم
نظر آئے جہاں حسنِ خداداد | مری خونِ جگر کھانے کی دیں داد
جو بدگو بد کہے اس کا نہیں ڈر | کہے جو خوب کو بد ہے وہ بدتر
وہی اس نظم کا لذت ربا ہو | جسے ہر علم کا حاصل مزا ہو

منیر جس نمونے سے اس مثنوی میں مختلف ائمہ کے امتیازی خصوصیات کو بیان کرتے ہیں اور نئے انداز سے بات میں بات نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے ان کی نکتہ دانی اور رنگین بیانی واضح ہو جاتی ہے۔ زبان میں روانی سلاست اور فصاحت و بلاغت کا لحاظ ہر قدم پر پایا جاتا ہے اگر بالغرض

محال کسی جگہ بوجہ تلفظ کے خلاف کسی لفظ کا استعمال پایا جاتا ہے تو بیشتر اس کا سبب وہ مجبوری ہوا کرتی ہے کہ جو شعر میں وزن اور قافیہ کی پابندیوں کی وجہ سے ضروری ہو جاتی ہے۔ مثلاً بعض اوقات انھوں نے "گر" بجائے "اگر" کے استعمال کیا ہے یا نون کو بجائے واضح کے مخفی استعمال کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں کچھ اس قسم کے واقع بھی سامنے آتے ہیں کہ جس میں انھوں نے قافیہ ردیف کی ان پابندیوں کو نظر انداز کر دیا ہے کہ جن کا لحاظ رکھنا وہ اپنے قصائد اور غزلیات میں ضروری سمجھتے ہیں۔ منیر کا خیال ہے کہ مثنوی نگاری میں اس قسم کی آزادہ روی اور سہولت کے لحاظ سے ان معاملات میں آسان پسندی ہر لحاظ سے جائز ہے اور قدیم اساتذہ فن بالخصوص مصنف معیار الاشعار نے اس کی اجازت دی ہے۔ ان کے یہاں اگر اس قسم کی کوئی فنی خامی یا کمزوری پائی جاتی ہے تو وہ انھوں نے عمداً کی ہے اور اس کی پوری ذمہ داری وہ اپنے سر لینے کے لئے تیار ہیں۔ اس مسئلہ پر منیر کی تنقید و تبصرہ ملاحظہ ہو۔

کہ ایسے لفظ ہیں اس نظم میں چند　　جو ہوں مکروہ طبع نکتہ پیوند
خلاف طرز نظم دلنشیں ہیں　　غزل تو کیا قصائد میں نہیں ہیں
مثال ان کی میں کرتا ہوں نمایاں　　رہے تا اہل بینش پر نہ پنہاں
اگر کی جا کہیں ہے گر بھی موزوں　　کہیں مفرد ہے مخفی لفظ میں نون
اسی صورت سے ہے ایک آبیات اور　　کہ اسکو دیکھیں گے صاحب غور
سمجھ کر میں نے باندھا اسکو ناچار　　جو نادانی ہو تو ہو جائے انکار
اگر دانستہ ہو شاعر سے کچھ کام　　تو پھر اس پر نہیں ہے کوئی الزام
علاوہ وجہ عمدہ اور بھی ہے　　کہ سب سے بڑھ کے وہ وجہ قوی ہے
محقق کی جو ہے معیار الاشعار　　کہا ہے خاتمہ میں اس کے اشعار

کہ جو ہیں قافیہ سے عیب منسوب     وہ کم ہیں مثنوی گوئی میں معیوب

اس مثنوی کے کہنے میں جو روایتیں قصیدہ گوئی میں پیش نظر رہتی تھیں اس میں منیر نے بہت کچھ نرمی اور تبدیلی برتی اور اس بات کی معذرت خواہی کے ساتھ متوقع ہیں کہ نکتہ سنج اور نکتہ شناس نقاد تنقید میں سخت گیری سے کام نہ لیں اور چھوٹی موٹی لغزشوں پر ان کو مورد الزام نہ ٹھہرائیں۔

علاوہ ازیں وہ اس مثنوی کو فنی شاہکار کے بجائے وسیلۂ نجات اور حصول مغفرت کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور چھان بین کرنے والوں سے بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ان کو دنیا سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ مثنوی صرف اپنی عقبیٰ بنانے کے لئے لکھی ہے جسب ذیل اشعار ان تاثرات کے آئینہ دار ہیں۔

توقع ہے یار باب خرد سے     نہ دیکھیں مثنوی کو چشم بد سے
خلاف اپنے طریقہ کی ہے منظوم     کہ وہ ہو جائے گا دانا کو معلوم
کرے جس وقت وہ آپ ہی مصنف     تو طعن اس پر نہیں کرتے ہیں منصف
علاوہ اس کے ہو عذر صحیح اور     سمجھ لیں اپنے دل میں صاحب غور
کہ لکھنا ہو احادیث فضائل     مطابق ترجمہ ہونا ہے مشکل
خصوصاً قید اوزان و قوافی     معاذیر صحیفہ کو ہے کافی
مطابق ترجمہ کے کیا ہو صورت     کمی بیشی ہوئی حسب ضرورت

---

دکھا دے جب یہ قدرت اپنی اللہ     تو تجھ سے جائزہ بھی مجھ کو دل خواہ
غرض ناقص ہوں سے دل ہے برہم     حسد سے جو کہیں اسکا نہیں غم
سبب اصلی ہے ذکر آلِ عبا کا     کہ یہ دفتر لکھا ان کی ثنا کا

نہیں کر سکتے ہیں کھل کر یہ اظہار — حسد سے کرتے ہیں بعض یہ گفتار
اشارہ کرتے ہیں بصد تاسف — کہ اس میں کیوں کیا اتنا تکلف
فسانہ یا کوئی تاریخ مرغوب — اگر تم نظم یوں کرتے تو تھا خوب
اسی میں صرف کرتے یہ مضامیں — زمانہ بھر میں ہوتا شورِ تحسیں
ہر ایک مذہب کے انساں اس کو لیتے — تمھاری داد خاطر خواہ دیتے
رگِ جاں کو یہ تقریریں ہیں نشتر — کہانی اس سے ٹھہراتے ہیں بہتر
نہیں اس نظم سے دنیا کا مطلب — فقط ہے خوبیٔ عقبیٰ کا مطلب

اس مثنوی کو پڑھ کر مصنف کی نادر الکلامی کے علاوہ زورِ طبیعت اور روانی بیان ظاہر ہوتی ہے مگر یہ مثنوی مذہبی جذبات کی مخصوص ترجمانی کی وجہ سے ہر مذہب و ملت کے لوگوں میں زیادہ مقبولیت نہ حاصل کر سکی۔ اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ واقعات کو طول بیانی میں بڑا دخل ہے۔ جس کے نمونے تمہید، مثنوی سے خاتمۃ الکلام تک ہر مواقع پر ملتے ہیں۔ ایک بات جو مختصر طور پر زیادہ موثر انداز میں کہی جا سکتی تھی اس کو اکثر و بیشتر انھوں نے اپنی طول بیانی سے کسی حد تک غیر موثر اور کم دلکش بنا دیا ہے۔ اس چیز کو مثنوی نگاری میں طول بیانی یا تفصیل نگاری کہا جاتا ہے اور بعض مواقع پر قابل قدر خیال کیا جاتا ہے۔ میر حسن کی مثنوی سحرالبیان اس کی ایک دلچسپ مثال ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ طول بیانی میں اگر تفصیل نگاری اور جزئیات کی مرقع کشی پیش نظر ہو تو نقادانِ فن کے خیال میں قابلِ اعتراض قرار نہیں دی جا سکتی۔ لیکن تطویل کلام اگر محض عبارت آرائی اور غیر ضروری تفصیلات اور تکرار بیانی کی حامل ہو تو بعض اوقات حساس اور نازک طبیعتوں پر اس کے گراں گزرنے کا امکان ہوتا ہے۔

منیر نے اس مثنوی کے لکھنے اور اس کے لئے مواد فراہم کرنے میں کافی فکر

نظر سے کام لیا ہے اور فصاحت و بلاغت، شاعرانہ صداقت و تاثیر کے اعتبار سے
کام لیا ہے اور فصاحت و بلاغت، شاعرانہ صداقت و تاثیر کے اعتبار سے مثنوی کا پایہ بہت بلند ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مثنوی کے مطالعہ سے منیر کی علمی بلند پائیگی زورِ طبع اور قوتِ تخیل کا ثبوت بخوبی ملتا ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اپنے معاصرین میں وہ ممتاز شاعر تھے۔ روانی، تسلسل، حفظِ مراتب اور واقعہ نگاری کے لحاظ سے بھی لاجواب مثنوی کہلا جا سکتی ہے۔ الفاظ کی نشست، محاوروں کی برجستگی اور حال سے قال کی مناسبت ایسی ہے کہ سخن فہم کو تحسین و آفریں پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ یہ مثنوی اگرچہ بہت قلیل مدت یعنی صرف سات[ا] ماہ میں مکمل کر دی گئی۔ لیکن مصنف کی ہمہ دانی مشقِ سخن و واقفیت نے اصولِ فن کو ہر جگہ قائم رکھا۔ اور اسقام و معائب کو حتی الامکان قریب نہیں آنے دیا ہے۔ علاوہ بریں شاعرانہ بلند پروازیوں اور نازک خیالیوں کے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ بطور نمونہ چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

(۱) ذکرِ شبِ معراج:-

کہاں ہے ساقیٔ گردوں تعلّی — کہاں ہے بادۂ حورا تجلّی
پلا دے ایک پیمانہ سرِ بزم — کہ سیرِ عالمِ بالا کا ہے عزم
ادھر آ اے مغنّی نوا ساز — کہ آئی کان میں زہرا کی آواز
رسولِ پاک ہیں مشتاقِ شب گیر — شبِ معراج کی جاگی ہے تقدیر
شبِ مشکینہ خال و عنبریں مو — شبِ کعبہ لباس و خالِ ہندو

---

ا؎ منیر نے خود مثنوی کے آخری حصہ میں لکھا ہے:-

بنا دل مدتِ تصنیف بھی راست — کہی جلتے دنوں میں بے کم و کاست
خدا شاہد کہ باطل یہ نہیں حرف — ہوئے ہیں ہفت ماہ اس میں فقط صرف

بنفشہ زار خلد کا مرانی　　کنیز اس رات کی شام جوانی
وہ شب جس کا غلام ابر بہاری　　وہ شب غیرت دہ مشک تتاری
وہ شب تنویر کعبہ ظلمت دہر　　وہ شب ظل ہمائے آسماں سیر
وہ شب مفتاح قفل راز دانی　　وہ شب شق نقیض لن ترانی
عروج طالع مسعود کی رات　　کلام عابد و معبود کی رات
اسی شب کو رسول عرش مسند　　عنایات الٰہی سے موید
سریر خواب پر پرتو فگن تھے　　گل بالیں خیابان چمن تھے
عیاں تھے خواب کے آنکھوں میں آثار　　دل بیدار نخل بخت بیدار
کہ ناگہ پیک فرخ فال آیا　　فلک سے مژدۂ اقبال لایا
کہا اے یکہ تاز عالم غیب　　جواہر سنج راز عالم غیب
خدا نے یاد فرمایا ہے چلئے　　براق برق تک آیا ہے چلئے

(۲) وصف معراج :-

حضیض و اوج جلوے سے ہم آغوش　　بلند و پست دونوں بادلہ پوش
چھپائے عیب امت جو وہ جامہ　　بطانہ جس میں رحمت وہ عمامہ
صباحت جس کا استر تھی قبا وہ　　لطافت جس کا ابرہ تھی عبا وہ

(۳) وصف براق :-

اسد ہیبت فلک پیکر قمر سم　　عنانیں دونوں جوزا سنبلہ دم
اگر مختار ہوتی اس کی چھل بل　　گزرنا علم حق میں سب سے اول

(۴) بیان شدت گرمی :-

بنی تھی دیگ گلخن دشت کا ریت　　ہرا تھا آگ میں تلوار کا کھیت
نہ ہوتی تھی چمک سے اس کو سیری　　نقاب روئے یوسف تھی اندھیری

۵۔ آغازِ صبح :۔

سحر آفاق میں آئی گئی رات — اُٹھی آبِ بقا سے قیدِ ظلمات
سحر طالع ہوئی گردوں دوں سے — کہ جوئے شیر نکلی بے ستوں سے
ہوا پایاب دریائے شبِ تار — جہازِ صبح کا بیڑا ہوا پار
کیا اندھیر چرخِ پُر دغا نے — ڈبو دی کشتیٔ مہ ناخدا نے
اُٹھا طوفان نورِ ماہ اندر — پھرا پانی گروہِ شپرک پر

مشتے نمونہ از خروارے چند مثالیں مختلف مقامات پر پیش کی گئی ہیں زیادہ تفصیلات کی گنجائش نہیں ہے۔ مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ منیر جامع الکمالات اور مستجمع الصفات شاعر تھے۔ ان کے مجموعۂ کلام میں ہر صنف کی شاعری کا نمونہ موجود ہے۔ ان کی دونوں مثنویاں اپنے موضوعات کے لحاظ سے بے مثل اور لاجواب ہیں۔ اور قدرتِ فکر زورِ طبع اور وسیع معلومات کا پتہ دیتی ہیں منیر کی مثنویوں میں غیر معمولی مبالغہ اور تخیل کی بے اعتدالی بالعموم نہیں پائی جاتی ہے اگرچہ معراج المضامین میں کہیں کہیں ائمہ کی تعریف کے سلسلہ میں منیر حدِ اعتدال سے کسی قدر آگے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں تو جس کی ذمہ داری زیادہ تر ان کے مذہبی عقاید کی غیر معمولی گہرائیوں اور شغف پر ہے۔ اس کے بالمقابل "حجاب زنان" کی زبان، انداز بیان کافی صاف ستھرا۔ سادہ سلیس ہے اور انکی سادگی و پُرکاری کو مسلم کر دیتا ہے۔ ایک قصیدہ گو اور غزل گو کے لحاظ سے جو قدر و منزلت منیر نے حاصل کی۔ ایک مثنوی نگار کی حیثیت سے بھی اس کو برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک مکمل اور قابل قدر شاعر تھے کہ جنھوں نے اپنے عہد کی تمام علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی تحریکوں کو اپنے کلام میں محفوظ کر لیا اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک معیاری یادگار چھوڑ گئے

# باب ششم

## منیر کی قصیدہ نگاری

### الف۔ قصیدہ اور اُردو کے ممتاز قصیدہ گو

قصیدہ وہ صنفِ سخن ہے کہ جس نے ہماری شاعری کو زورِ بیان اور علوئے خیال کی دولت عطا فرمائی۔ قصیدہ کی بدولت ہماری شاعری نے اظہارِ جذبات، بلند پروازی اور تخیل کی عظمتوں کو پہچانا۔ غزل اگر ہماری شاعری کی آبرو ہے تو قصیدہ ہماری شاعری کی زیب و زینت اور وقار و افتخار۔

جیسا کہ قصیدہ کے تاریخی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا عرب سے ہوئی۔ عرب میں قصیدہ کسی خاص مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر کہا جاتا تھا۔ اور اس سے بہت سے مذہبی، سماجی، اخلاقی اور ادبی کام لئے جاتے تھے۔ جب ایران مسلمانوں نے فتح کر لیا تو فارسی ادب پورے طور سے عربی سے متاثر ہوا اور عربی قصیدہ کی خصوصیات بھی فارسی میں آگئیں۔ یہاں آکر انھوں نے بہت کچھ رنگ آمیزیاں، شیوہ بیانیاں، بلند پروازیاں اور مشکل پسندیاں اپنی خصوصیات میں شامل کر لیں۔ اردو ادب نے جب فارسی ادب سے مختلف خصوصیات مستعار لیں تو اُردو قصیدہ نگاری بھی فارسی قصیدہ نگاری کے نقشِ قدم پر چلنے کو

کو اپنے لئے موجب افتخار سمجھنے لگیں۔ ہمارے اردو قصیدہ نگاروں نے جو معرکتہ الآرا قصائد لکھے اور جن کی وجہ سے انھوں نے قصیدہ نگاری میں نام پیدا کیا۔ وہ سب فارسی قصیدہ نگاری کی روایات کی بدولت تھا کہ جس کی انھوں نے حرف بہ حرف اور قدم بہ قدم تقلید کی اور اکثر اوقات اس کا تذکرہ بھی اپنے قصائد میں ضمناً کر دیا۔ وہی بحریں اختیار کیں۔ وہی قافیہ و ردیف، وہی تشبیب اور گریز کا انداز اور مدح ممدوح میں وہی ذاتی اور صفاتی تذکرے، ہاتھی گھوڑے اور تلوار کی تعریف اور عرض مدعا کے بعد دعایہ خاتمہ۔ کچھ قصیدہ نگاروں نے اپنے قصائد کے مخصوص نام بھی رکھے مثلاً سودا کا قصیدہ ہے "باب الجنت" اور میر شکوہ آبادی کا "در نجف" وغیرہ وغیرہ۔

ظاہری شکل و صورت اور قدیم روایتی تقلید کا عالم تو وہی رہا۔ لیکن اردو قصائد اپنے موضوعات اور اندازِ کلام کے لحاظ سے عربی سے بہت کچھ مختلف ہو گئے جس کی زیادہ تر وجہ فارسی قصیدہ نگاروں کی تقلید ہے ہمارے قصائد میں اخلاقی، تہذیبی اور سماجی پہلو بالعموم بہت ہلکے پڑ گئے اور بعض اوقات بیجا اور عام طور پر بے جا مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی خصوصیت عام ہو گئی۔ بیشتر جس کا سبب وہ توقعات تھیں کہ جو ممدوح سے انعام و اکرام حاصل کرنے کے سلسلے میں کی جاتی تھیں اس مبالغہ آرائی اور بے جا مدح سرائی کا قابلِ قدر پہلو یہ نکلا کہ زبان اور انداز بیان میں جوش و خروش، استقلال و استحکام، شکوہ الفاظ اور رفعت خیال وغیرہ وغیرہ کی خصوصیات عام ہوئیں اور ان کی معرکہ آرائیوں کی بدولت ہماری شاعری کو غیر معمولی توانائی اور طاقت حاصل ہوئی جس نے آگے چل کر مسدس اور دیگر اصنافِ نظم کی صورت میں اپنے کارنامے دکھائے۔

ہمارے قصیدہ نگاروں میں سوداؔ پہلے شخص ہیں جنھوں نے فارسی قصیدہ نگاری کے مقابلہ پر اُردو قصیدہ کو اہمیت دینے کی کوشش کی اور اس صنف سخن کی بدولت اپنا نام روشن کیا۔ اس کے بعد ذوقؔ نے اس شمع کو روشن رکھنے اور صنف ادب کو مزید خصوصیات اور زورِ بیان کا حامل بنانے میں اور قصیدہ کو علمی اور ادبی رنگ دینے میں نام حاصل کیا۔ غالبؔ اور مومنؔ نے کچھ ذہنی ضروریات کے لحاظ سے اور کچھ اس خیال سے کہ قصیدہ گوئی کی مشق نہ ہونا شاعری کی علمی اور فنی کمزوری شمار کیا جاتا تھا۔ قصیدہ گوئی کی مشق سخن جاری رکھی۔ اس کے بعد جس شخص نے مجموعی حیثیت سے قصیدہ کی سب خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے اس صنف میں کمال دکھایا۔ وہ منیرؔ شکوہ آبادی ہیں۔

قصیدے کے اجزائے ترکیبی یا عناصر ضروری حسب ذیل ہیں جن کے ربط باہم کی خوبیوں پر قصیدہ کی کامیابی کا دار و مدار ہوا کرتا ہے۔

۱۔ تشبیب۔

۲۔ گریز

۳۔ مدح ممدوح

۴۔ عرضِ مدّعا

۵۔ خاتمہ

## (۱) تشبیب

تشبیب یا تمہید قصیدہ کا وہ جزو اولیں ہے کہ جس کی دلکشی اور لطافت پر قصیدہ کی کامیابی بہت کچھ منحصر ہوتی ہے۔ پہلا شعر جو مطلع اوّل کی حیثیت رکھتا ہے خاص اہمیت کا مالک ہوتا ہے اور ندرتِ بیان، جدت ادا سامعین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ شاعر کبھی بہار کا تذکرہ کر کے، کبھی حسن و عشق کے مناظر بیان کر کے، کبھی خود اپنے مصائب کا ذکر کر کے کبھی حسن و عشق کے مناظر بیان کر کے

کبھی خود اپنے مصائب کا ذکر کر کے اور کبھی اپنی خوبیوں کو فخریہ انداز میں پیش کر کے ممدوح کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ممدوح شاعر کی زبان سے اپنی خوبیوں کا تذکرہ سن کر خوش وقت ہوتا ہے۔ مطلع کی اہمیت کے متعلق شیخ چاند لکھتے ہیں :-

"سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ مطلع کس پایہ کا ہے نہ ہی مطلع کامیاب سمجھا جاتا ہے جس میں کوئی نئی جدت آمیز بات بیان کی جائے تاکہ طبیعت خوش اور سامع آئندہ کلام کے سننے کے لئے فوراً متوجہ ہو جائے۔ خیال کی ندرت، بیان کی جدت اور زبان کی شگفتگی و برجستگی اگر مطلع میں نہ ہو تو وہ کامیاب نہیں سمجھا جاتا۔"[۱۰۱]

قصیدہ گوئی کی اس اولیں خصوصیت یعنی تشبیب کو پیش نظر رکھتے ہوئے منیر کے قصائد کی تشبیب پر حامی بریلوی کی یہ رائے حقیقت پسندانہ معلوم ہوتی ہے لکھتے ہیں کہ

"تشبیب میں آندھی کی طرح اٹھتے ہیں اور بادل کی طرح گرجتے ہیں۔ جتنا معانی کا ہجوم ہے۔ اس سے زیادہ الفاظ کی دھوم ہے خصوصاً جب تشبیب کے بعد مطلب کی طرف گریز کرتے ہیں تو وہ موقع قابل دید ہوتا ہے۔"[۱۰۲]

منیر شکوہ آبادی کے قصائد کی تشبیب و تمہید ہر اس معیار پر جو اہل نظر نے قائم کیا ہے۔ غیر معمولی طور پر قابل قدر قرار دی جا سکتی ہے مثلاً ایک نعتیہ قصیدے میں گزشتہ شب کی پریشانیوں کا بیان کر کے موت و ہستی میں مناظرہ سے پہلے ہجوم بلا کے بیان میں کہتے ہیں سہ

---

۱۰۱ - سودا - شیخ چاند صفحہ ۱۸۷، ۱۸۸

۱۰۲ - آجکل ۱۵ ستمبر ۱۹۴۹ء مضمون منیر شکوہ آبادی از شن رائل، حامی بریلوی صفحہ ۱۳۰

شبِ گذشتہ ہجومِ بلا سے تھا وہ چار — نصیب سوتے تھے فتنے ہزاروں تھے بیدار
مہیب رات تھی ایسی کہ تھی خدا کی پناہ — زباں ہر سر مو پر تھی الاماں کی پکار
مکان گور تھا فرشِ خاک بالشِ سنگ — کھڑے تھے بھاگنے کے واسطے در و دیوار
دلِ غریب سے یوں کروٹیں بدلتا تھا — کہ جیسے وغدغے میں رنگِ چہرۂ بیمار
عجب نہیں ہے جو آنکھوں کو راہ بھولے نیند — اندھیرے گھر میں غش آ آ کے پھر گیا کئی بار
نمونہ کاہکشاں اس طرح تھی گردوں پر — کہ جیسے سنگِ سیہ پر ہو چیونٹیوں کی قطار

ایک دوسرے قصیدے کی تشبیب میں بہار کا منظر کتنے پُر لطف طریقہ سے پیش کرتے ہیں ؎

خوشی بہار کی شاہ و گدا کو ہے یہ عظیم — کہ پھولی ہے شفق شال سرخ و تمام گلیم
منجموں کو جو لکھنی ہے نور کی تقویم — عدم سے کھینچ کے آئی بیاضِ دستِ کلیم
بہار و بیچھو گی اشرفی و نسریں کی — بنا ہے بوٹیوں سے تحفہ نسخہ زر و سیم
ریاضِ دہر میں فیضانِ رنگ یوں ہے عام — سہیل کی نہیں محتاج اب عقیق ادیم
شہ و گدا ہیں ہم شکلِ سنبل و نسرین — صباحِ عید ہے زیبِ کنار تمام گلیم
ہوا ہے خندۂ گل کا یہ شور دنیا میں — سنائی دیتی نہیں رعد کی بھی صوتِ عظیم
ہوائے دامنِ گل باغِ ہند میں اگر آئے — ستی کو آتشِ سوزاں ہو باغِ ابراہیم
ریاضِ دہر میں ہے کثرتِ گل کو یہ قوت — سنائی دیتی ہے صوتِ ہزار باغِ نعیم
بنے ہوئے ہیں اصولِ دفترِ گلشن دہر — زمانے کو نہیں کہہ سکتے دہر یہ بھی قدیم
چمن سے موجِ رطوبت گئی جو تا بہ فلک — اٹھا بہشت میں طوفان کوثر و تسنیم

## (۲) گریز

گریز قصیدہ کا وہ اہم حصہ ہے کہ جس میں شاعر تمہید اور کسی غیر متعلق باتوں سے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور سلسلۂ کلام کی دلچسپیوں کو قائم رکھتے ہوئے رخ بدل کر بلا کسی تصنع یا بظاہر آورد کے مدح ممدوح

کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح بات میں بات پیدا کرتا ہے کہ سننے والے کو مجبوراً کسی کی تعریف سننے پر راضی نہ ہونا پڑے بلکہ فطری طور پر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ شاعر مدح سرائی پر اور سننے والے اس کی صداقت پر ایمان لانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ گریز کی کامیابی پر قصیدہ کی دلکشی کا بہت دارومدار ہوتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ منیر کے قصید اس سلسلے میں ان کی ندرتِ فکر، جدتِ خیال اور حسنِ بیان کے آئینہ دار ہیں مثلاً

چھپی رات یوں تیرغ بیضا کے ڈر سے کلیسا میں جیسے سیہ پوش راہب
شقاوت سے تھا جیل خفاش منکر کھلے تیرہ بختی سے ان کے معائب
مگر شام کی فوج کے تھے مقلد گریزندہ جلوہ سے ظلمت کے طالب
تھے سرگرم اطفاء نورِ الٰہی یہی چاہتے تھے کہ ظلمت ہو غالب
کئے ظلم انھوں نے جو سبطِ نبیؐ پر یہ ممکن نہیں لکھ سکے کلکِ کاتب
شہِ کربلا آفتابِ امامت جگر گوشۂ غالبِ کل غالب
دل و جانِ ختمِ رسلؐ روحِ زہراؓ ملک اس کے خدام قدسی مصاحب

**(۳) مدحِ ممدوح** تیسرا جزو مدحِ ممدوح ہے۔ اس میں ذاتی اور باطنی خوبیوں کا بیان ہوتا ہے۔ مثلاً عدل، فیاضی، حسن، ان کے اخلاق و عادات، گھوڑے ہاتھی کی تعریف وغیرہ۔ اس میں مبالغہ ہونا اشد ضروری ہے۔ منیر کو اس میں کسی حد تک کامیابی ملی۔ مثلاً نواب تجمل حسین خاں رئیس فرخ آباد کے گھوڑے، ہاتھی اور تلوار کے سلسلے میں ایک قصیدے میں لکھتے ہیں ؎

تیر ایسا ہے یہ گھوڑا دمِ رفتار اگر پھینک دو ڈھال جگہ میں کوئی اچھا گوہر
شش جہت میں یہ فلک سیر پھر آئے جاکر ایک پہلو بھی نہ بدلے ابھی اصلا گوہر

ٹوٹا کیا کہ نہ ہو نام کو میلا گوہر ہاتھی ایسا ہو بہک رو کہ قدم سے جس کے
برسے اس ابر پہ مست سے کیا کیا گوہر پانی خرطوم سے پھینکا تو بنا وہ در خوش آب
پہنے پھرتی ہے عروس شب یلدا گوہر دیکھ کر موتیوں کی جھول یہ سب کہتے ہیں

**(۴) عرض مدعا** مدح ممدوح کے بعد عرض مدعا کیا جاتا ہے۔ اس حسن طلب سے کام لے کر ممدوح کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یعنی شاعر اپنا مقصد بیان کرتا ہے اور اس کو اس میں اس قدر سحر بیانی اور فسوں کاری سے کام لینا پڑتا ہے کہ ممدوح کی طبیعت پر گراں نہ گزرے اور وہ بخیل ہے تو کریم بن جائے اور شاعر کا دامن مراد گوہر مقصود سے بھر دے۔

**۵۔ خاتمہ** قصیدے کے اجزائے ترکیبی میں آخری چیز خاتمہ ہے۔ خاتمہ میں یا تو اظہار مقاصد کیا جاتا ہے یا ممدوح کے لئے دعائیہ جملوں پر اس کو ختم کیا جاتا ہے۔ انداز بیان یہ رہتا ہے کہ جس شان و شوکت سے اس کی تشبیب، تمہید لکھی گئی ہے اور جس باوقار انداز میں اس کی ابتدا کی گئی ہے۔ اس معیار کو قائم رکھا جائے اور قصیدہ کا خاتمہ تشبیب کے مقابلہ میں کسی طرح پست نظر نہ آئے اور سامعین پر وہی تاثر اور عظمت برقرار رہے جو کہ شروع میں قصیدہ نگار نے قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً میر ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں ؎

ردیف کے لئے کی عمدہ اختیار گرہ میر کو ہے کشاکش کی آپ سے امید
ہمیشہ کھولتے تھے شاہ ذوالفقار گرہ سپرد ناخن سرکار کر دیا ہے اب

میر نے اپنے قصائد میں متذکرہ بالا روایتی انداز کو نبھاتے ہوئے چند نئی چیزوں کا بھی اضافہ کیا۔ انھوں نے قصائد کو محض تعریف پر ہی مبنی نہیں

رکھا بلکہ اپنے گرد و پیش کے حالات، سیاسی انقلابات اور خود اپنی زندگی کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ وہ اپنے ایک قصیدہ "فریاد زندانی" میں جزیرہ انڈمان کا نظارا اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جس کو پڑھ کر آنکھوں کے سامنے وہاں کی تصویر پھر جاتی ہے نیز منیر کے ذاتی حالات بھی اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ مناظر قدرت کا بیان بعض اوقات ایسا مفصل اور دل کش ہو کہ ہماری شاعری میں نطرت نگاری اور مصوری کے لئے بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً سمندر کے شور کا جس طریقہ پر تذکرہ کیا ہے۔ وہ مجسم ہو کر سب آوازیں کانوں میں گونجنے لگتی ہیں اور طوفانی کیفیت مکمل ہو کر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ وہاں کے حالات کا اس نئے انداز سے اور شاعر کے ذاتی اور دیگر بسنے والوں کے حالات پوری طرح سے بیان کرنے سے ان کی اس قوت مشاہدہ کی داد دینا پڑتی ہے کہ جس کی وساطت سے انھوں نے جزیرہ انڈمان کے باشندوں، نیز اپنے ساتھیوں اور مختلف لوگوں کے احساسات اور جذبات کا تذکرہ کیا ہے اور انقلابات دہر کی بدولت جو مصائب وہاں کے باشندوں پر پڑے ہیں۔ انکی تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔ اس قصیدہ کی غیر معمولی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بطور نمونہ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

غنی ہیں اژدہا و سیل و چیتا و بوم ان رہ زنوں
کسے دیں گے سلاطینِ جہاں جاگیر ویرانی

چنے کھانے کو تر سیں صاحبانِ گوہر عالی
صدف کو دے نوالہ موتیوں کا ابر نیسانی

امیروں سے بلائے غدر پہنچے ان غریبوں تک
کہ بے قدری و ضعف حال میں جن کا نہیں ثانی

سزا جو ظالموں کو دی وہ حق تھی چشم ما روشن
مگر ہم سے غریبوں کی عبث کی خانہ ویرانی
جو کل مزدور تھے وہ آج ٹھہرے راج کے مالک
جو شب کو ہتر انی تھی ہوئی دن کو مہارانی

پڑے ہیں ٹھوکروں میں کاسۂ سر بادشاہوں کے
اچھل رہ ہے کس کا سر پچھاڑ کر تاج سلطانی
کسی نے کوڑیوں کے مول بھی پوچھا نہ ان روزوں
چڑھے نیلام پر سلطان و نواب و خاقانی

ترقی کو تنزل ہے تنزل کو ترقی ہے
فلک پیش زمیں حاضر ہے بہر تہنیت خوانی
نکل کر بند سے آنا ہوا اس جزیرے میں
اسیروں کی سیہ بختی سے کالا ہو گیا پانی

نکلوا کر وطن سے بھر دیا جنگل میں لاکھوں کو
جگہ رہنے کی اب باقی نہیں غول بیابانی

سمندر کے شور کا بیان:۔

سمجھ کر شور محشر اس کو مُردے چونک پڑتے ہیں
یہ دریا شور کرتا ہے کہ ہوتا ہے جگر پانی
شب و روز اپنی قسمت پھوڑتا ہے سنگ ساحل سے
سفید قیدیاں ہو خاک بتھر اس کی طغیانی
تقاطت آب دریا میں ہے زمی سنگ ساحل میں
کلیجہ پانی کا پتھر ہے پتھر کا جگر پانی

## (ب) منیر کے قصائد کی تفصیل و تصریح

منیر کے دواوین میں کل ۲۹ قصائد پائے جاتے ہیں جس میں دس مذہبی ہیں اور باقی دنیاوی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

دیوان اول میں پہلا قصیدہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کی منقبت میں ہے۔ دوسرا قصیدہ مجتہد العصر سید محمد صاحب کی مدح میں ہے۔ جو خاندان غفران مآب لکھنؤ میں ایک بہت بڑے عالم اور مجتہد تھے۔

تیسرا قصیدہ واجد علی شاہ کی تعریف میں ملتا ہے۔

چوتھا قصیدہ نواب ذوالفقار علی بہادر والئ باندہ کے نام ہے۔

پانچواں قصیدہ نواب تجمل حسین خاں کی شان میں پایا جاتا ہے۔

دیوان دوم میں صرف ایک قصیدہ بارھویں امام علیہ السلام کی شان میں پایا جاتا ہے:۔

دیوان سوم میں کل تیئیس قصیدے ملتے ہیں۔ دو قصیدے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں پائے جاتے ہیں۔ پہلے قصیدہ میں زندان کا ذکر ہے اور دوسرے میں ہستی و موت کا مناظرہ پیش کیا ہے۔

تیسرا اور چوتھا قصیدہ امیرالمومنین کی منقبت میں ہے۔

پانچواں قصیدہ جناب سیدۃ النساء العالمین کی شان میں ملتا ہے۔

چھٹا قصیدہ حضرت علی اکبر کی منقبت میں ہے۔

ساتواں قصیدہ حضرت خامس آل عبا سید الشہداء کی منقبت میں ہے۔

آٹھواں قصیدہ حضرت علی موسیٰ رضا علیہ السلام کی شان میں ہے۔

نوسے تیرہ[۱۳] تک اور پندرہ سے تیئیس[۲۳] تک چودہ[۱۴] قصیدے نواب کلب علیخاں کے نام ہیں جو مختلف مواقع پر لکھے گئے ہیں۔

چودھواں قصیدہ جناب مولوی منشی احمد حسن خاں صاحب بہادر عروج کی مدح میں لکھا گیا ہے۔ جس میں مختصراً منیرؔ نے قید سے رہائی پانے اور وہاں کی زندگی کا ذکر کیا ہے۔

## منیرؔ کے قصائد کی خصوصیات

منیرؔ کے قصائد کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک پرگو اور نادر الکلام قصیدہ گو تھے اور چونکہ منیرؔ کو فطری طور پر جودت طبع، علو ئے تخیل اور تکرار حاصل تھی۔ اس لئے ان کے قصائد میں ایک غیر معمولی جدّت اور ندرت ہے منیرؔ نے جو منقبت اور بزرگانِ دین کی شان میں قصیدے لکھے ہیں بالمقابل ان قصائد کے جو اہلِ ثروت کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان میں زور اور تاثیر زیادہ ہے۔ کیونکہ دل سے نکلے ہیں اور ذاتی مصائب اور ذہنی الجھنوں کی کیفیتیں ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ منیرؔ کے قصائد کے متعلق جلال الدین احمد جعفری زینبی لکھتے ہیں :-

> "مضامین و تخیل کے لحاظ سے منیرؔ نہایت کامیاب قصیدہ گو ہیں۔ طبیعت کی روانی نے ہر موقع پر اپنا خاص اثر دکھایا ہے۔ مطالعہ قصیدہ سے ان کی نادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے کہ کس قدر مسلم الثبوت ہیں۔ تشبیب دیدہ بہت پسندیدہ ہوتی ہے۔ چونکہ منیرؔ کی عمر کا کچھ حصّہ پریشانی اور آوارہ گردی میں گذرا تھا۔ اس لئے ان کے بعض قصائد ان واردات قلبی کا آئینہ ہیں۔ انھوں نے نہایت وضاحت سے اپنے واقعات قید و الم لکھے ہیں اور مذہبی زاویۂ نگاہ سے نعت و منقبت میں اپنے دردِ دل کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"[۱]

اور اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی لکھتے ہیں :-

"منیر کے قصائد زور دار ہیں الفاظ پرشکوہ، بندشیں چست اور خیالات بلند ہیں۔ قصائد کی تشبیب میں طرح طرح کے مضامین باندھے ہیں"[1]

فی الحقیقت منیر شکوہ آبادی کی قصیدہ گوئی کی ممتاز خصوصیات میں شکوہ الفاظ جوش بیان، زور کلام، علوئے خیال اور مبالغہ، ندرت فکر، جدت ادا، مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات کا استعمال، تخیل، تسلسل بیان اور روانی سب کچھ شامل ہیں۔ ان قصائد میں روایتی مضامین کے علاوہ تاریخی و معاشرتی حالات بھی ملتے ہیں (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) ان کے تمام قصائد ابتدائے تشبیب سے عرض حال اور مدعا تک بہت مرتب مضبوط اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں اور کوئی مضمون کہیں پر بے جوڑ نہیں ہونے پاتا۔ قصائد میں لفظی شان و شوکت اور معنوی بلندی و رفعت جس قدر ضروریات فن میں شامل ہیں۔ وہ سب ان کے قصائد میں پائی جاتی ہیں۔ منیر کا مزاج چونکہ محض روایت پرست ہی نہیں بلکہ ادب میں انادیت اور مقصدیت کا بھی کسی حد تک قائل ہے اس وجہ سے ان کے قصائد میں اپنے عہد کے سماجی اور معاشی رجحانات نیز اپنی زندگی کے غیر معمولی واقعات واضح طور پر ان کی قصیدہ گوئی میں ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

منیر کے قصائد میں حسب ذیل خوبیاں پائی جاتی ہیں :-

ا۔ سوانح حیاتی اشارے

---

[1] مختصر تاریخ اردو ادب اصغر حسین نظیر لدھیانوی صفحہ ۲۷۰ (بار اوّل)

۲۔ معاصرانہ عہد کی عکاسی اور سیاسی حالات
۳۔ سنگلاخ زمینیں تشکیل ردیف و قافیہ
۴۔ رعایت لفظی و مرصع کاری۔
۵۔ علوئے تخیل اور پرواز فکر۔

(۱) منیر کے قصائد میں سوانح حیاتی اشارے جا بجا ملتے ہیں۔ جن سے ان کے حالات زندگی لکھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے قصائد میں اپنے متعلق ذاتی اور شخصی پریشانیوں کا ذکر بہت پُر درد الفاظ میں پیش کیا ہے۔ مثلاً:

اس زمانے میں کہا ہے یہ قصیدہ میں نے ۔ کہ مصائب میں گرفتار ہیں اعلیٰ اسفل
روز ہوتا ہوں نئے شخص کے گھر میں روپوش ۔ آج پھانسی کی خبر ہے تو اسیری کی ہے کل
لنگ ہے تن پہ بدن فرش پہ اک کہنہ حصیر ۔ جان و عزت کی ہے زندگی مصیبت ہر پل
مال و سرمایہ و اسباب ہوا سب برباد ۔ پر کتابوں کے تلف ہونے سے ہے کرب اجل
میری تصنیف سے تھے جتنے رسالے نایاب ۔ ان کے گم ہونے سے ہے لذت ہستی میں خلل

ایک اور قصیدہ میں فرماتے ہیں:-

بارے آئی نجات کی باری ۔ کھل گیا عقدۂ گرفتاری
ہم کو منصب ملا رہائی کا ۔ قید کو جائداد بیکاری
نظر آیا سوادِ کلکتہ ۔ شکر ہے شکر حضرتِ باری

(۲) منیر کا سیاست سے یوں تو کوئی تعلق نہ تھا۔ اس عہد میں اہلِ فرنگ کی جو سیاسی سرگرمیاں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں نظر آتی تھیں۔ ان کے اشارے ان کے کلام میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ مثلاً انگریزی فوج کی ہندوستان میں جو کارگزاریاں تھیں ان کی طرف سے اشارہ کرتے ہوئے ایک قصیدہ میں

کہتے ہیں ؎

خسرو روز کرے مملکت شب میں جو دخل
ہند میں کیوں نہ کریں اہلِ فرنگ آ کے عمل

پرتوِ مہر جو ہو شمعِ شبستانِ حمل
غازۂ صبح بنے قشقہ ہندوئے زحل

چمن لالہ صحرا میں چٹکتا ہے گلاب
لال کرتی ہیں تو اعدہ ہوئے چلتے ہیں رغل

منیر نے اپنے قصائد میں جس طرح اپنی ذاتی اور رنجی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے۔ اسی کے ضمن میں انھوں نے پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے حالات کی طرف بھی نہایت موثر طریقہ پر اشارے کئے ہیں۔ ان تباہیوں اور بربادیوں کو بھی بیان کیا ہے کہ جن سے اہلِ شہر کا سابقہ پڑا ہے۔ جیسے قدیم عمارات کو منہدم کر کے نئی سڑکوں کی تعمیر پر منیر افسوس اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ ساتھ ہی چھتر منزل اور قیصر باغ کی ویرانی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

محل سونے کے ڈھلے کھد گئے ایوانِ مینائی
بنا ہے کہنہ گورستاں کی صورت قصرِ سلطانی

محل و باغ کا بیٹس البدل وحشت فزا سڑکیں
کہ جن کے عرض سے نادم ہے طولِ عمرِ شیطانی

کیا زاغ و زغن نے آشیانہ چھتر منزل میں
سرِ تختِ ہما ہیں بوم صرفِ بال افشانی

گلستانِ ارم میں دھوم ہے مرگھٹ کے دعوت کی
تکلف سے ہے قیصر باغ میں گھوڑے کی نہائی

منیرؔ کے قصیدے ان تمام خصوصیات کی بدولت تاریخی اہمیت کے مالک بن گئے ہیں ان سے واجد علی شاہ کی معزولی، غدر کے حالات، اس کے بعد کی افراتفری اور بدحالی کی ایک عمومی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

ایک قصیدہ جو رامپور میں لکھا گیا ہے اور جس کا مطلع ہے۔

رُت ہے برسات کی بہت پیاری
موج زن جھیلیں، ندیاں جاری

اس قصیدے میں وہاں کے درباری شعرا، علماء، فضلاء، صاحب اقتدار لوگوں کا حال اور دیوان خانہ کی رونق وغیرہ وغیرہ کے حالات بالتفصیل ملتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اکثر منیرؔ نے اپنے قصائد میں حالات کا ذکر جن سے وہ متعلق رہے اس طرح کیا ہے کہ جن کی مدد سے وہاں کی سماجی تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ منیرؔ کے اس قسم کے قصائد ایسے مذاق پر مبنی ہیں جو اس وقت اُردو کے لئے بالکل نیا تھا۔ ان کا قصیدہ جو رامپور کی تعریف میں ہے وہاں کی عمارتوں، باغوں اور سوسائٹی کی ایسی صحیح تصویر دکھاتا ہے جو اردو شاعری کی تاریخ میں ایک نئی بات ہے۔ مثلاً رامپور کے سرکاری باغ کے حالات اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

کیا کروں باغ بے نظیر کا وصف ۔۔۔ جس سے ظاہر ہے قدرتِ باری
چوٹیاں اٹھیں لاشتوں کے پچھلے ۔۔۔ دیکھ پائیں جو چار دیواری
عطر مجموعہ کی زمین تمام ۔۔۔ گرد خوشبو سے مشک تاتاری
رنگ ہر پھول سے ٹپکتا ہے ۔۔۔ شاخ ہر گل بنی ہے پچکاری

کوٹھی کے بیان میں فرماتے ہیں:۔

اس کی کوٹھی کی کیا بہار کہوں ۔۔۔ کی ہے رضواں نے جس کی معماری

دلِ عارف کی طرح کمروں میں — روشنی نورِ حق کی ہے ساری
دامنِ گل کے پھیلنے میں ہے — شفقِ چرخ کی نمو داری
کہیں گھونگھٹ میں ہے عروسِ بہار — کہیں مثلِ بتانِ آزاری

شہر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

فصلِ بارش میں شہر پاکیزہ — ہے زمیں آئینہ صفت ساری
ہر سڑک کہکشاں گزرگاہوں سے — حسن و خوبی میں ہے سوا پیاری
شہر میں بے تلاش مل جائے — جس کو جس شے کی ہو طلبگاری
ایک ہی شے یہاں نہیں ملتی — جس کو کہتے ہیں لوگ ناداری
ہے مربع سے بڑھ کے ہر بازار — ہر گلی کوچہ باغ کی کیاری
نور ترلولیہ کا چار طرف — چاندنی چوک میں ضیا باری

(۳) منیر نے مشکل سے مشکل زمینوں میں قصائد پیش کیے ہیں۔ مثلاً واجد علی شاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کی زمین ہے "گوہر آب میں"، "نشتر آب میں"۔ اور اس سنگلاخ زمین میں صرف بیس پچیس شعر کہہ کر قصیدہ کو ختم نہیں کیا ہے بلکہ اس غواصِ سخن نے اس بحرِ ناپیدا کنار سے چھیاسٹھ موتی نکالے ہیں۔ اس قصیدہ کے علاوہ بھی مشکل زمینوں کے قصائد ان کے دواوین میں ملتے ہیں۔ اور انھیں مشکل زمینوں میں کبھی کبھی ایسے بے مثل شعر کہے ہیں کہ جو ان کی قادر الکلامی کو مسلم الثبوت بنا دیتی ہو۔ مثلاً:

سمجھ لے قدر جو اکسیر خاکساری کی — تو اپنی گانٹھ میں باندھے مرا غبار گرہ

منیر نے اپنے قصائد میں ردیف کو پوری طرح نبھایا ہے اور کوشش کی ہے کہ ہر قافیہ کا استعمال بہ حسن خوبی ہو جائے۔ ان کی پر گوئی نے ہر قصیدے کو غیر معمولی طور پر طویل بنا دیا ہے اور درد گوئی کا یہ عالم ہے کہ

تقریباً دو دو سو اشعار کے قصائد ایک ایک دن میں کہہ ڈالے ہیں جیسا کہ ایک قصیدہ میں خود ہی فرماتے ہیں ؎

قصیدہ کہا ایک دن میں یہ میں نے
عجب کیا کہ ہوں اہلِ معنی معاتب

علاوہ ازیں ایک اور قصیدہ جو امیر المومنین علیہ السلام کی شان میں ہے اور جس میں ایک سو بانوے اشعار ہیں۔ اس قصیدہ میں انھوں نے تمام اساتذہ کے قصائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

انوری عرفی و سودا خورشید و سحر — اشرف لکھنوی اقبال امیران اجل
محتشم بھی ہو ثنائی بھی ہو حسینی بھی ہو — اور بھی ان کے علاوہ کئی استاد اکمل
ان کے اس درجہ توانائی میں قصائد ہیں نظم — فارسی والوں کی تو فکر ہو سب سے اول
مگر ان صاحبوں نے بھی نہیں کوتاہی کی — ایک سے ایک ہو اس بات میں ذی اکمل
نوبت اس ہیچمداں کی ہوئی ان سب کے بعد — اب سنیں اہلِ سخن ملتمس عبد اقل
اس کو ان سب کے قصائد سے مقابل کر لیں — نہیں کمتر بھی اگر ان سے تو نکلے افضل
دور آخر مرے حصہ میں دیا ساقی نے — پی گیا اس مئے نایاب کی ساری بوتل
التزام ایسے قواعد کے کئے ہیں میں نے — جن شرائط میں حریفوں سے یہ مشکل ہو غزل
اس زمانے میں کہا ہے یہ قصیدہ میں نے — کہ مصائب میں گرفتار ہیں اعلیٰ اسفل

منیر ۱۲۷۶ھ (جیسا کہ اس قصیدہ کے مقطع سے معلوم ہوتا ہے) میں بعد غدر بہت پریشان حال تھے۔ اس وقت انھوں نے یہ طویل قصیدہ لکھا ہے۔ اس سے ان کی زود گوئی اور پُرگوئی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ منیر کو خود اپنی شاعرانہ عظمت کا احساس تھا جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار میں فرمایا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرا معرکۃ الآرا قصیدہ نواب رامپور کی مدح میں ایک سو انتیس اشعار کا ہے

جس کا مطلع ہے :-

مجھے یہ فکر ہے اے چرخ کچھ تو منھ سے بول
کہ پھر رہا ہے زمانے میں کیوں تو ڈانوا ڈول

اس قصیدہ میں ایک مشکل قافیہ "تول، ڈول، جھول، کھول، وغیرہ وغیرہ ردیف کے اختیار کر کے شعر کہنا شروع کئے ہیں۔ ان قوافی میں جب تمام لوازم قصائد ممدوح کے ہاتھی، گھوڑے، تلوار اور سخاوت وغیرہ کی تعریف نظم کر چکے تو ممدوح کی حسب فرمائش قوافی کے اعراب میں ایک تبدیلی کرتے ہیں اور مضمون کو بدل کر مفتوح کر دیتے ہیں اور سڈول، پستول وغیرہ قافیوں کا استعمال کر کے اپنی پختہ مشقی اور معنی آفرینی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں مثلاً:-

کہوں قوافی مفتوحہ میں جدا قطعہ
ہوا ہے حکم کہ ان موتیوں کو بھی اب رول

پھر اسی قصیدہ کے قطعہ بہ عنوان "قطعہ در قوافی مشکلہ" میں فرماتے ہیں ؎

جو ایسے قافیوں میں کوئی ایسے شعر کہے
تو دو دل میں حلقہ بگوشی کا اس کی طبع کو قول

یہ شعر دیکھ کے بائن کے جو کرے منظوم
تو اس کو اپنی ہی تقلید کا میں سمجھوں ڈول

منیر ہاتھ اٹھا ایسی خودستائی سے
خدا کے واسطے پڑھ نام کبریا لاحول

کلام نغز ہے ہر چند سنت شعرا
مگر منافی طبع سلیم ہے یہ قول

(۴) منیر دبستان لکھنؤ کے شاعر تھے اور ان کے استاد بھی خاص لکھنؤ اسکول کے

بازبیانی تھے۔ اس لئے لکھنویت کا ایک ممتاز عنصر کہ جس کو رعایت لفظی اور مرصع کاری کہا جاتا ہے ۔ منیر کے یہاں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ۔ مثلاً ایک قصیدہ میں کہتے ہیں ؎

بتوں کی بالیوں کی لو نہ تک نہ پہونچے گی
کھلائے مچھلیوں کو گو لیاں ہزار گرہ

سبیل آبلہ پا جو تم نے رکھ دی ہے
بنی ہے عین عنایت سے آبدار گرہ

تمھاری سال گرہ کو جو کہکشاں کہہ دوں
در نجوم گرہ پر کرے نثار گرہ

(۵) منیر کی قوت متخیلہ کی پرواز بہت بلند تھی۔ انھوں نے حیات و موت کا مناظرہ جس انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ لاجواب و بے مثال ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

زمانے بھر کی بلاؤں میں مبتلا تھا میں  —  خفا ہیں جان سے تھا جان مجھ سے تھی بیزار
ادھر تو کھینچتی تھیں سخت جانیاں دامن  —  ادھر قضا مرے لے جانے کے لئے تیار
میں طرفہ ردو بدل تازہ کش مکش میں تھا  —  مرے لئے ہوئی ہستی و مرگ میں تکرار
ہر اک کو دونوں میں دعوائے افضلیت تھا  —  ہر ایک کرتی تھی اپنی فضیلتیں اظہار

منیر ہستی کے فوائد کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

بیان کرنے لگی ہستی یہ تھا کس لئے مرگ  —  میں تجھ سے بڑھ کے ہوں آگاہ ہیں صغار و کبار
مرے طفیل سے قائم ہیں آسمان و زمیں  —  مجھی سے ہیں مہ و خورشید مطلع انوار
مرے سبب سے ہیں ہادی دین حق قائم  —  مرے سبب سے ہیں ابدال صاحب اسرار
خدا نے کھائی قسم ہستی محمدؐ کی  —  تو کیا ہے عرش کو بھی میں ہوئی بلند وقار
مرے سبب سے خضر رہنمائے عالم ہیں  —  مرے سبب سے مسیحا ہے آسماں سیار

محیطِ دہر میں ہوں بہ رنگِ کشتیٔ نوح  ترے وجود میں طوفانِ قہر کے آثار
مرے پیالے میں آبِ حیات ہے لبریز  تری شراب میں مخلوط زہرِ عقرب و مار
خراب ٹوٹے ہوئے مقبرے تری جاگیر  مرے نصیب میں سونے کے قصرِ مینا کار
ترے دماغ کو حاصل عفونتِ اموات  مرے مشام میں عطرِ نفیس مشکِ تتار
ترا ہے نام زمانے میں ہادمِ لذات  جہان و جاں کی بقا کے لئے ہوں میں معمار
خطاب سب نے دیا مجھ کو جانِ شیریں کا  ہر ایک تلخیٔ بے نفع سے تری بیزار
مرا جلوس سواری ہے صحت و طاقت  ترا غبار قدم رنگِ چہرۂ بیمار
مرے ہی دم سے ہیں ایوان زرنگار آباد  ترے قدم سے خرابی کے ہر طرف آثار
ترے نصیب میں ہے بوریا صفِ ماتم  مجھے خدا نے دیا بادشاہوں کا دربار
مرے نصیب میں بانگِ نشاط نغمۂ عیش  تری بساط میں ہے نوحہ اور نالہ زار

پھر موت اور اس کے مدعا کس قدر دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

کہا یہ مرگ نے بس بس خموش اے ہستی
کچھ اس میں راست ہو کچھ لاف ہے تری گفتار

میں وہ ہوں جس سے لرزتے ہیں سرکشانِ جہاں
میں وہ ہوں جس سے ہیں عاجز ستمگر و اشرار

جو میں نہ ہوتی تو کرتا نہ کوئی طاعتِ حق
جو میں نہ ہوتی تو ہو جاتے سب غریب آزار

مرے سبب سے شہیدوں کو ہے حیاتِ ابد
مرے سبب سے ہیں پیوندِ خاک بدکردار

مرے وسیلے سے ابرار وارثِ فردوس
مرے طفیل سے اشرار ہیں وقودِ النار

پسند آتی ہے تو کس کو ضعفِ پیری میں
کہ اپنی جان سے ہو جاتے ہیں بشر بیزار
ترے سبب سے ہیں محلوں میں چند دولت مند
ہزار دل رنج سے ہیں نالہ کش پسِ دیوار
تری شراب نہیں ہے خمار سے خالی
نہفتہ نوش میں تیرے ہیں نیش زہر ہزار
ہزار دل ہیں مرضِ مفلسی سے جاں بر لب
بتا تو کس کو پلاتی ہے شربتِ دینار
ہزار دل قید میں روتے ہیں جان کو تیری
مجھے بلاتے ہیں سر پھوڑ پھوڑ کر ہر بار
زمانے بھر میں ہے شکوہ ترے تلوّن کا
کسی کے ساتھ نہیں تیری ایک سی رفتار
کبھی کو کھینچ کے مسند سے خاک پر پھینکا
کسی کو ڈال دیا چاہِ غم میں یوسف وار
امیر تھے جو سلیمان عہد دنیا میں
برنگ مور وہ پھرتے ہیں دانہ کو ناچار
غضب ہے تخت سے جمشید کو اتار دے تو
ستم یہ اور ہے ضحاک کو کرے مختار
بتا جو نزع کی مشکل نہ میں کروں آساں
تو تا بہ حشر پڑا تڑپے نیم کشتہ شکار
اگر کروں نہ سبکدوش میں دم سکرات
تو بار خاطر اہل و عیال ہو بیمار

تو ضحکہ کھینچتی ہوں میں ہر غریب کا پردہ
تجھے بھی چاہیئے ہو دل سے میری منت دار

غرور کرکے ہوئے مدعی خدائی کے
ترے سبب سے سلاطین ظالم و جبّار

خوشی میں تو نے تمہارِ علیہ کو رکھا
ملول تجھ سے رہے انبیائے عرش وقار

نبیؐ نے حکم دیا قیل انت مو تو کا
جہان میں رہے مشتاق رہتے ہیں ابرار

علوئے تخیل کے ساتھ ساتھ علمی اصطلاحات، تلمیحات، کنایات، استعارات وغیرہ کی میرؔ کے کلام میں بہتات ہے۔ علاوہ ازیں حسین اور نادر تشبیہات، پرشکوہ زبان، پرجوش اور عالمانہ انداز بیان ان کے یہاں بکثرت موجود ہے۔

ایک قصیدہ میں جو امام حسین علیہ السلام کی شان میں لکھا ہے اور جس کا مطلع ہے۔

اشکِ زلیخا ہوئے، بحرِ صفت جوشِ زن
غرق ہوا نیل میں یوسفِ گل پیرہن"

اس میں میرؔ نے مصطلحات و استعارات و کنایات کا غیر معمولی اور بکثرت استعمال کیا ہے۔ اس قصیدہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرؔ اور مولانا فضل حق کی رہائش ایک ہی جگہ تھی اور اکثر و بیشتر علمی صحبتیں رہا کرتی تھیں۔ ایک دن دوران گفتگو میں صنف قصیدہ گوئی پر کچھ بحث و مباحثہ ہوا اور مولانا نے میرؔ کو قصیدہ کی چند خوبیوں کی طرف متوجہ کیا اور قصیدہ نگاری کے نئے رجحانات، نئے پہلوؤں اور نئے زاویوں سے آگاہ کیا۔ چنانچہ اس

معرکتہ الآرا قصیدہ میں جو "خامس آلِ عبا" کی شان میں لکھا گیا ہے۔ خود بشیر کے الفاظ میں مباحثہ اور اس کے نتائج ملاحظہ ہوں ؎

مولوی بے نظیر فضل حق اسم شریف — دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و مؤتمن
قید میں میں اور وہ رہتے تھے ایک جگہ — عین سمندر میں تھے غرقہ بحرِ محن
کہنے لگے ایک دن کچھ سبب اس کا بتا — شاعر اردو زباں آہیں ہوں یا کہن
مصطلحاتِ عجم اور کنایات فرس — کس لئے کرتے نہیں زینت نظمِ سخن
یا متحمل نہیں لہجۂ اردو زباں — یا کوئی لائق نہیں تم میں سے اے اہلِ وطن
گو کہ غزل میں نمو پر ہے قصیدہ میں فرض — دقتِ مضمون سے ہے حسن بوجہ حسن
حضرتِ سودا بغیر کس نے قصیدے کہے — وہ بھی پر اس راہ میں ہو نہ سکے قطرہ زن
شاعروں میں جز غزل پھر نہ کسی نے کہا — زعم میں گو اپنے ہوں طوطی شکر شکن
میں نے کہا راست ہے آپ جو فرماتے ہیں — آپ سنیں تو کہے کچھ یہ اسیرِ محن
مصطلحاتِ غریب جو کہ نہ معروف ہوں — نظم کرے کس طرح شاعرِ ہندی سخن
جو ستعارف ہوا شاعروں میں پہلے سے — انکو بھی سن سن کے آج ہوتے ہیں سب طعنہ زن
کہنے لگے یہ کلام مہمل و بے مغز ہے — ہیں شعرا بے سواد جہل ہے ان کا وطن
گرم ہوئے بڑھ گیا سلسلۂ تہر و تبسم — بسکہ تھے نازک مزاج ما تھے پہ آئی شکن
کہتے تھے وہ بار بار ہندیوں سے ہے محال — رمز و کنایات میں دقت و لطفِ سخن
ہو کے ادب سے خموش پھر یہ قصیدہ کہا — کوچہ نوین چلا تا صدِ منشق کہن
قید میں قحطِ کتاب حافظہ از بس ضعیف — پر مدد غیب سے خامہ ہوا حرف زن
بعض نامہ ایک خاص طبع کی ایجاد ہیں — نظم ہوئیں جو تھیں یاد مصطلحات کہن
نصف قصیدہ کیا سامنے ان کے رقم — ختم ہوا جب وہ تھے ہم دم گور و کفن
میری خطائیں کریں صاحبِ انصاف عفو — قید میں خود میں ہوں پوچ پوچ ہے میرا سخن[١٠٤]

---

١٠٤؎ نظم بشیر صفحہ ۴۴، ۴۵

منیر کو فطری طور پر جودتِ طبع، علوئے تخیل اور فکرِ رسا حاصل تھی۔ اسی وجہ سے ان کے قصائد میں جدت اور ندرت ہے۔ لطیف اور معنی خیز اشعار کی کثرت ہے۔ تشبیہ میں لطافت پیدا کرتے ہوئے منیر ہاتھی کی بلندی اور رفتار کو بادل کے لئے قابلِ تحیر و استعجاب قرار دیتے ہوئے ایک قصیدہ میں فرماتے ہیں ؎

ہے تسلیم خمیدہ ہے سرِ فیلِ فلک　　کیا کروں فیل سواری کی بلندی اظہار
ایسی دیکھی نہیں رفتار سیہ مستی کی　　اکثر اٹھتا ہے تماشے کے لئے ابرِ بہار

ایک اور قصیدے میں گھوڑے کی سرعتِ رفتار کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

شعلہ دم برق قدم شیر شمیم آہو دم　　رعد آواز پری پیکر و صرصر رفتار
حال سے اس کے حیرانِ فلکِ چین بجبیں　　نعل محراب درِ رحمتِ ربِ غفار
بارہا آنکھوں سے ہم دیکھ چکے ہیں یہ رنگ　　تو جو عینک کو لگائے ہوئے ہوتا ہے سوار

لطیف اور معنی خیز اشعار کی مثالیں

آئی ہے موجِ خندہ گل اکثر آب میں　　بچہ ہے عندلیب کا ہر گوہرِ آب میں
نہلاتا ہے نخلِ گل آفتاب کا　　پرتو ہے شعاع سے ہر چکر آب میں
رنگینیٔ بہار سے موجیں ہیں شاخِ گل　　گل برگ تر ہے مچھلیوں کا ہر پرِ آب میں
ماہتیں بدل گئیں فصلِ بہار سے　　ہوتا ہے سبزہ کھیت اگر خنجر آب میں
ہنگامِ غسل سینۂ شفاف کھول دو　　آئینہ جمال ہو ہر پتھر آب میں
سمجھیں یہ عدل تو ضعفا سے تو ہی ڈریں　　مچھلی کے پر مگر کو بنیں خنجرِ آب میں

منیر کے قصائد قابلِ ستائش ہیں۔ انھوں نے قصیدوں میں غیر معمولی معنی آفرینی پیدا کی ہے۔ فارسی شعرا کے قصائد کا بغور مطالعہ کر کے ان کی باقاعدہ طور پر تقلید کی ہے اور انھیں کے قصائد کو پیش نظر رکھ کر انھیں کی زمینوں میں قصیدے لکھے ہیں۔ اکثر منیر نے ایسی زمینیں بھی نکالی ہیں جن میں قصیدے نہیں

لکھے گئے تھے اور جن کی طرف ہمارے مشہور قصیدہ نگاروں نے بھی توجہ نہیں کی تھی۔ مختصر یہ ہے کہ ان کے قصائد میں علاوہ خیال، جوشِ بیان و قوتِ متخیلہ کی بلند پروازیوں کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ تفصیل نگاری اور شکوہِ بیانی خاص طور سے قابلِ توجہ ہے۔ میر کو اپنے قصیدوں کی ان خصوصیات پر خود بھی ہے اور جا بجا اپنے قصائد میں مختلف مشہور قصیدہ نگاروں کے قصائد سے اپنے کلام کو مقابل کرتے ہوئے تحریہ انداز میں کہتے ہیں ؎

مدح حاضر میں سنا دے کوئی مطلع ایسا
انوری زرد ہو رنگ اڑ نے لگے شوکت کا

اسی طرح ایک دوسرے قصیدے میں فرماتے ہیں ؎

اب یہ ہیں التماس نکتہ رسان و فہیم    شاعرانِ زباں دانِ واقفِ رازِ کہن
عذرِ صحیح و قوی پھر میں کروں گا مگر    میری خطا بخش دیں پہلے سب اہلِ سخن
شاعروں میں بے مثال سحر بیانِ ناخری    مادح سلجوقیاں نامیٔ عہدِ کہن
پہلے قصیدہ کہا اس نے ہو اس طرز میں    پھر ہوئے صرفِ جواب بعض سرانِ سخن
ہندیوں نے اس طرف اپنی توجہ نہ کی    ہو گئے اس طرز میں پہلے ہیں حرف زن

اس کے علاوہ ایک اور قصیدے میں لکھتے ہیں۔

ممدوح کے کرم سے قصیدہ رقم کیا    تھے ورنہ اس زمین میں بے اختیار ہاتھ
گھنٹوں پہ یوں صرف ہو گئی وہ فارسی گہر    اردو کے موتیوں کا بھی کر لیں شمار ہاتھ
کمتر نہ پائیں سب سے قصیدہ میر کا    انصاف سے نہ کھینچیں جو دانش شعار ہاتھ

میر کی قصیدہ گوئی کے ساتھ اس کی وہ غیر معمولی شان جو امراء و رؤساء کے درباروں میں قصیدہ نگاری میں پائی جاتی تھی۔ تقریباً ختم ہو گئی۔ گویا وہ محفلِ قصیدہ گوئی کی اس انداز کی آخری شمع تھے۔ میر کے بعد جن لوگوں نے

قصیدہ گوئی کی طرف توجہ کی۔ وہ یا تو مذہبی رنگ میں تھے اور یا پھر محفل مقاصدہ
کے سلسلے میں کہے گئے تھے یا اخلاقیات سے تعلق رکھتے تھے مثلاً عزیز
اور اسمٰعیل میرٹھی کی کوششیں قابل داد ہیں۔ میر نے قصیدہ گوئی کے میدان
میں اس بات کی کوشش کی کہ ان کے قصائد مشہور اور نامور قصیدہ
نگاروں کے مقابلہ میں کمتر نہ رہنے پائیں، بلکہ کسی حد تک فارسی قصیدہ
نگاری کی قدیم روایات اور اردو قصیدہ گوئی کی مقبول خصوصیات میں کچھ
اضافہ کریں۔ انھیں تمام انفرادی خصوصیات، وسعت مطالعہ اور علم و
فضل کی خوبیوں کی بدولت میر شکوہ آبادی ایک نامور قصیدہ گو مانے
جاتے ہیں۔ جس انداز سے ہماری قصیدہ نگاری کی ابتدا سودا نے کی تھی اور
ذوق اور ناکر، کے ہاتھوں پروان چڑھی تھی۔ ان سب کی تکمیل ہم کو میر
کے قصائد میں ملتی ہے۔ وہ درباری قصیدہ نگاری میں بھی ایک بلند مرتبہ
کے حامل ہیں۔ اور واقعہ نگاری، مسائل حاضرہ کے تذکروں، خود ان کی
زندگی کے حالات، صاف ستھری نکھری زبان، علمی اصطلاحات اور تلمیحات و
اشارات کی کثرت وغیرہ ان کے قصائد کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ انھوں نے
قصیدہ میں معنی آفرینی، مداحی اور بلند پردازی بھی دکھائی اور زندگی کے روزانہ
پیش آنے والے مسائل و سانحات کے تذکرے بھی کیے ہیں۔ علم و فضل کو زندہ
رکھنے کا بھی کام کیا ہے اور مصطلحات کے مطالعہ کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا
ہے۔ چنانچہ اس قسم کی تمام خصوصیات میر کو ایک بلند قصیدہ نگار بناتی ہیں،

# باب ہفتم

## "میرؔ اور فنِ شعرگوئی"

میرؔ نے فنِ شعرگوئی ایسے اساتذہ کی صحبت میں حاصل کیا تھا کہ جس کا معیاری ہونا مسلّم ہے۔ انھوں نے اس فن کو خونِ جگر صرف کرکے اپنایا تھا اور اپنی تنقیدی تخلیقی صلاحیتوں اور فکرِ رسا کی مدد سے اس میں پختہ کاری اور شگفتگی پیدا کی تھی۔ میرؔ نے اپنے عہد کے تمام روایتی اصولِ شعرگوئی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے طبعی رجحانات کے مطابق اس میں ترمیمات اور اصلاحات پیش کیں اور اپنے عہد کے تقاضوں اور عوام و خواص کی ضروریات کے مطابق روایتی طریقوں میں رد و بدل کرکے امتیاز حاصل کیا۔ انھوں نے جو نظریۂ شاعری اپنے ذہن میں قائم کیا۔ اس کو اپنی شاعری میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی اور اس طرح شعر و سخن کی زندگی سے قریب تر لانے اور واقعات و حقائق کو شاعری کا جز بنانے کی ایک کامیاب کوشش کی۔

### میرؔ کا نظریۂ شاعری

میرؔ نے اپنی شاعری کی ابتدا کسی خاص نظریۂ شاعری کے ماتحت نہیں کی۔ لیکن جس ماحول میں وہ پیدا ہوئے اور انھوں نے جس قسم کے اساتذہ کی صحبت اٹھائی یا جن درباروں سے وہ وابستہ رہے اور جن سیاسی اور سماجی تبدیلیوں سے وہ متا

نوقتاً متاثر ہوتے رہے۔ اسی کے مطابق انھوں نے اپنا نظریۂ شاعری مرتب کیا اور اپنی شاعری میں اس کو سمونے کی کوشش کی۔

ان کی زندگی اور شاعری کے تفصیلی مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے شاعری کو محض تفریح طبع یا درباداری کے لئے مخصوص نہیں کیا بلکہ مذہبیات سے مخصوص دلچسپی ہونے کی بدولت انھوں نے شاعری کو مذہبی روایات کا خزینہ بھی بنانے کی کوشش کی۔ جیسا کہ ان کی مثنوی معراج المضامین کے جائزہ میں تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں ان کو اخلاقی قدریں بھی بہت عزیز تھیں اور شاعری کو تبلیغ اخلاق کے کام میں لانا بھی ضروری سمجھتے تھے۔ مثنوی "حجاب زناں" اس کا بیّن ثبوت ہے۔ اسکے علاوہ ان کے تاریخی قطعات اور کچھ قصائد جو مخصوص ماحول، حالات اور واقعات سے متعلق ہیں۔ ان کے اس نظریۂ شاعری کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ شاعری کو، واقعات اور حالات کی تاریخ بنا کر بھی پیش کیا جا سکتا ہے اس طرح سے تاریخ نگاری کی خشکی کو شاعرانہ لطافت اور شیرینیا سے ہم آہنگ کر کے دور کیا جا سکتا ہے۔ ادب اور تاریخ کا ایک دلچسپ ملا جلا نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ گویا ان کے نظریۂ شاعری میں کھلی ہوئی مقصدیت اور افادیت نہ ہونے کے باوجود در پردہ ادبی دبی افادیت اور مقصدیت موجود ہے۔ جس کی بدولت ان کے تاریخی مجموعہ بن گئے ہیں اور اپنے عہد کی ان تاریخی کیفیتوں کو بہت وضاحت، صداقت اور خوبصورتی کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

منیر کے ابتدائی کلام میں بیشتر لکھنویت نظر آتی ہے۔ انھوں نے شاعری کی ایسی رنگین فضا میں آنکھ کھولی جس میں خیالی عالم آرائی اور

نغمہ سرائی نے شاعروں کو حقائق کی طرف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اس وقت لکھنؤ کی شاعری کا رنگ بقول عبدالحئی صاحب یہ تھا:۔

"جس میں پاک اور بے لوث عشق کی جگہ پر ہوس پرستی کے جذبات کی تصویر کھینچی گئی ہو۔ اس کا افسوس ہے کہ اس دور میں جرأت انشاء اور رنگین نے ترقی دے کر اس ناپاک طریقہ کی بنیاد ڈال دی جس پر متاخرین نے بلند عمارتیں کھڑی کر دیں اور یہ رنگ اتنا مقبول ہوا کہ سنجیدہ اور پاکیزہ خیام ذم بخود ہو کر رہ گئے"۔ [۵۵]

میر نے مندرجہ بالا بیان کی ہوئی فضا میں آنکھ کھولی۔ انھوں نے بھی اسی طرح سوچا جو دوسرے شعراء کا رویہ تھا۔ بے شک انھوں نے اتنا ضرور کیا کہ تخیل کو اس طرح سجا کر پیش کیا کہ اپنے ہم عصر شعراء میں آگے بڑھ گئے کچھ عرصہ بعد غدر کے اثرات سے میر کے کلام کا رخ بدل گیا اور وہ خیالی عالم آرائی اور نغمہ سرائی کے بیان سے حقائق پر آگئے۔ پھر لکھنؤ اور دہلی کا ملا جلا رنگ جو رامپور میں پرورش پا رہا تھا۔ اس کی پیروی کرنے لگے۔

میر کو جدت پسند شاعر تو نہیں کہہ سکتے ہیں پھر بھی انھوں نے ان اصولوں کو آگے بڑھایا جس کی ابتدا ناسخ نے کی تھی۔ بقول آل احمد سرور:۔

"لکھنؤ کے مخصوص رنگ میں جو ناسخ و آتش اور ان کے تلامذہ کا عام رنگ ہے۔ جدت ایک جذبۂ خود لئے ہوئے ہے۔ فن کی پرستش جب فن کی خاطر ہوتی ہے تو فن کو ہمیشہ محدود کر دیتی ہے۔ اچھے ادیب کے لئے ہمیشہ کچھ میل کی ضرورت ہوتی ہے مگر یہ میل بلند تصورات جاندار حقائق اور معنی خیز تجربات کا ہونا چاہیئے۔ لکھنؤ کے غزل گو شعرا

---

۵۵۔ تذکرہ شعرائے اردو۔ موسوم بہ گل رعنا۔ مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب۔ صفحہ ۷۳

نے اچھا زمانہ پایا مگر انھوں نے اچھی قدریں نہ پائیں"۔[۵۱]

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی سے پہلے اور بعد کو بھی ناسخ کے تلامذہ نے ان کے اصول کو یکجا کرنے اور فصاحت و شیرینی کلام کے قواعد مرتب کرنے کی طرف توجہ کی۔ اسی زمانے کی منیر کی ایک تنقیدی تصنیف "سنانِ دل خراش" جو ناسخ کی تصنیف "انتخاب نقص" کے اعتراضات کے جوابات میں لکھی گئی اس قسم کی کوششوں کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ کتاب ۱۲۹۶ھ میں لکھی گئی اور اس میں مرزا دبیر اور میر انیس کی مرثیہ گوئی پر جو اعتراضات کئے گئے تھے۔ ان کے جوابات دئے گئے ہیں۔ یہ کتاب شعرا کی بہترین رہبر اور اردو مرثیہ نگاری کی نہایت معتبر تاریخ ہے۔ منیر نے جس نمونے سے تحقیق و تصدیق سے کام لیا ہے وہ بے مثل ہے اور آج بھی ان کو بطور خزینۂ معلومات اور اصطلاحات پیش کیا جاسکتا ہے۔

سنان دل خراش کی اشاعت سے ادبی شعور کو نئی راہیں ملیں اور ان کے پیش کئے ہوئے جوابی دلائل سے لوگ کافی متاثر ہوئے۔ گھروں محفلوں اور گلی کوچوں میں چرچے ہونے لگے۔ مشہور شاعر نے اپنا زور طبع دکھا کر جو امام رکھا تھا ہی اثر اس کے اندر بھر کر لوگوں کو سمجھا دیا کہ مرثیہ گوئی اردو میں ایک جداگانہ فن ہے۔ انھوں نے اس کتاب کے شروع میں مرثیہ کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ وہ مرثیہ گویوں کے دوسرے اصناف کے شعرا کا مقلد اور تابع نہیں مانتے انھیں یہ احساس تھا کہ اظہار بیان کے لئے تقلیدی دائرے سے نکل کر جدتیں کی جاسکتی ہیں۔

منیر ایسے الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال کرنا صحیح سمجھتے ہیں جو خواہ فارسی

---

۵۱ ادب اور نظریہ۔ آل احمد سرور۔ صفحہ ۱۹ (مطبوعہ سرفراز پریس، دادان محل روڈ۔ ۱۹۵۴ء۔

ہیں صحیح نہ ہوں لیکن اردو کے اہلِ زبان میں مروج ہوں۔ اس سلسلے میں مسیح الزماں نے لکھا ہے :-

"ایسے الفاظ اور تراکیب کے متعلق اکثر بحث رہتی ہے کہ اردو میں کچھ ہیں اور فارسی میں کچھ۔ لیکن ایسے رجعت پسند جو لکیر کے فقیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ اس کے الفاظ کے لئے ضروری نہیں کہ اس صورت میں بولے جائیں کہ فارسی میں منشی منیر نے اس بحث کو متعدد جگہ یوں واضح کر دیا ہے کہ شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔"

"اصل تو یہ ہے کہ شعرائے اردو کے کلام میں بلکہ علی العموم سب کی زبان پر ایسے الفاظ مرکبہ (جو فارسی میں مستعمل نہیں) بہت دائر و سائر ہیں تو ان کی ترکیب سے باہم گفتگو ترک کر دیں ؟ کیا کریں ؟ مرثیہ گویوں کی اصطلاحیں اور بعض الفاظ مفردہ مرکب سب سے جدا ہیں کہ ان کو ایسے الفاظ سے چارہ نہیں شعروں کو تو بدول ایسے الفاظ کے چارہ نہیں۔ دیکھئے خاقانی ہند صفحہ ۱۶ میں فرماتے ہیں :-

اے ذوق بس نہ آپ کو صوفی بنائیے
معلوم ہے حقیقت " ہو حق " جناب کی

"ہو حق" کو فارسی کے اساتذہ نے اگر اس طرح کہا ہو تو بتا دیجئے صدہا لفظ اس قسم کے شعرائے اردو کے اور از انجملہ آپ کے استعمال میں ہیں۔"[۱]

---

[۱] اردو تنقید کی تاریخ - مسیح الزماں لکچرار - الہ آباد یونیورسٹی صفحہ ۲۱۹، ۲۲۰ - پہلی جلد اکتوبر ۱۹۵۴ء

اس کتاب میں صرف اعتراضات کے جوابات ہی نہیں پیش کئے گئے ہیں بلکہ وہ اصول بیان کر دئے گئے ہیں۔ جن کے مرثیہ گو پابند تھے۔ اس میں انھوں نے زبان کے بعض ایسے اصول اور فن مرثیہ گوئی کے متعلق ایسے نکات بیان کئے ہیں جن کی طرف لوگوں نے بہت کم توجہ کی ہے۔ ان کے پاس الفاظ کا خزانہ تھا۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی مہارت تھی تابت اور علمیت کی بناء پر دلائل لاجواب پیش کئے ہیں۔ انھوں نے خود "سنانِ دل خراش" میں ایک جگہ لکھنؤ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"سنہ ۱۲۸۲ھ سے سنہ ۱۲۸۷ھ تک جو آفتاب الدولہ قلق اور جناب تدبیر الدولہ بہادر آسیر کے مکانوں میں ہر مہینہ دو صحبتیں شاعرے کی ہوتی تھیں۔ تو وہ شاعرے صرف اعتراضات کے لئے مقرر تھے اور شرط تھی کہ جو ان میں شریک ہو وہ اعتراض پر بُرا نہ مانے اگر اعتراض غیر وارد ہے تو جواب معقول دے کر حریف اور سب سامعین کو سمجھا دے۔ ورنہ اس اعتراض کو قبول کرے۔ بڑے بڑے شاعر خوف سے نہ آتے تھے۔"

یہ اس زمانے کا ایک خاص دستور تھا کہ تمام ادیب اور شاعر اس قسم کی ادبی بحثوں میں مشغول رہتے تھے۔ لوگوں کے اشعار پر مختلف پہلوؤں سے رائے زنی اور نکتہ چینی ہوا کرتی تھی۔ بحث مزے کی گفتگو سن کر نئے لوگ بھی زبان اور بیان کی نزاکتوں سے واقف ہو جاتے تھے۔ شاعر شاعرہ میں غزل پڑھنے سے پہلے اس کو خود غور سے دیکھتا تھا اور اکثر کسی استاد کو دکھا لیتا تھا۔ کیوں کہ فن شعر کی کوئی لغزش لوگ مشکل ہی سے درگزر کرتے تھے۔ ذرا سی چوک پر ہی لوگ اعتراض کرتے تھے اور اس انگشت نمائی کے چرچے مدتوں شہر

میں رہتے تھے۔ منیر اس قسم کی محفلوں میں ضرور شریک ہوتے اور کافی دلچسپی لیتے تھے۔

مختصر یہ کہ اس زمانے کی تصانیف میں اگرچہ ہم دیکھیں تو "سنانِ دلخراش" ایک اہم تنقیدی کارنامہ ہے۔ اس کتاب سے مصنف کی قدرت اور ہمہ دانی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ مسیح الزماں تحریر فرماتے ہیں

"منشی منیر میں ہمیں ایک ماہر زبان و ادب اور ایک وسیع النظر نقاد کے خصوصیات ملتے ہیں۔ جن کو زبان کے پڑھنے اور پھیلنے کے ساتھ اس کی تھوڑی بہت تبدیلیوں کا بھی ہے۔ اور اگرچہ وہ بنیادی طور پر قدامت پسند ہیں لیکن پھر بھی ان میں زمانے کے اعتبار سے ترقی پسندی یا تغیر پسندی کی کمی نہیں۔ ان کو شاعر کی حیثیت سے تو سب ہی جانتے ہیں، لیکن ایک تنقید نگار کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔" ؎

سنانِ دلخراش میں تین سو تیس صفحات ہیں۔ جس میں سے چند اقتباسات حسب ذیل درج کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کی تنقیدی عبارتیں منیر کے اس نظریۂ شاعری کو سمجھنے میں کافی مددگار ہوتی ہیں کہ جس کے ماتحت انھوں نے اپنی شاعری کو آگے بڑھایا اور اس سے علم و ادب کی خدمت اور زبان کی شستگی اور برجستگی کا کام لیا۔

(۱) "بچھی صفِ ماتم پسر ہند کے گھر میں"

مندرجہ بالا شعر میں صف یعنی "بوریا" استعمال ہوا ہے جس پر اعتراض

ہے۔ منیرؔ اس کے جواب میں چند دلائل پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں :-

"آتشؔ مرحوم نے فرمایا تھا ؎

کسی کے محرم آب رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

ناسخؔ والوں نے اعتراض کیا تھا کہ محرم انگیا کے معنی پر عربی میں نہیں آیا۔ اس معنی پر ہندی ہے۔ پس اضافت غلط ٹھہری۔ منیرؔ مرحوم بھی ناسخؔ و رشکؔ کے شاگرد رشید تھے وہ بھی غلط کہہ بیٹھے ہیں۔ میں کہتا ہوں جس طرح "صف ماتم" جائز ہے اسی طرح "محرم آب رواں" کوئی فرق نہیں۔ اس کو خارج کرنا میرے نزدیک تحکم ہے۔ ناسخؔ مرحوم نے اسی ندرو مخاطر ہو کر تتبہ جبات فرمایا۔ حالانکہ جبات کہیں عربی و فارسی میں نہیں ملتا۔ اردو میں ضرور بولتے ہیں۔ ناسخؔ کا یہ شعر ہے ؎

کسی پریاں ستہ جبات کو بھی آٹھ پہر ہے یہ حسرت کہ سنگ کوچۂ جاناں ہوتا
پھر بھی کہو کے چھیڑنے کی میری خو نہیں عطر سہاگ ملتے ہیں وہ جس میں بو نہیں

نواب مصطفےٰ خاں بہادر شیفتہؔ دہلوی کا یہ مطلع ہے آپ کی رو نمائی کے بموجب کہتا ہوں کہ سہاگ کا عطر کیوں نہ کہا۔ ترکیب اضافی ہندی و عربی میں کیا معنی۔ سہاگ فارسی میں کوئی شے نہیں ہے۔ جب ایسے محقق فن جو آپ کے بھی ممدوح اور تذکرہ میں بہ مدح و ثنا ذکور ہیں کہیں تو مرثیہ گویوں کو کیا امر مانع ہے۔ صف ماتم میں دونوں لفظ ہندی ہیں اور عطر سہاگ و عطر فتنہ و تعویذ قبر لکھنا جائز ہو تو اردو میں منع کرنا محض تحکم اور عبث ہے اور جو یہ فرمایا کہ صف کا لفظ بمعنی بوریا ہندی ہے۔ ہم کہتے ہیں ہوتے ہوں زمانہ سابق میں ہندوستان کا دستور ہوگا کہ سوگ میں بوریا بچھاتے ہوں گے

مگر اب لکھنؤ اور غیر لکھنؤ میں امرا اور تھوڑے سے اہل استطاعت ماتم اقربا یا ماہ عزا میں بوریے کا فرش نہیں بچھاتے۔ بلکہ بہا نسطر بھی چاندنی کا فرش مرسوم ہے اور ہزاروں آدمی جو اہل علم سے ہیں۔ وہ صف بمعنی بوریا نہیں بولتے اور نہ کسی شاعر معتبر لائق نے اب تک نظم کیا۔ پس یہ لفظ اس معنی پر خارج عن اللہجت ہے۔"

نشان دلخراش صفحہ ۱۶۰، ۱۷۰)

(۲) قولہ :- کچھ بڑھ کے پھرے جانب قبلہ شہ بے پر
شبح کی طرف دوستش ہیں گردن انور

"بے پر کے کیا معنی۔ یہ لفظ اس شعر میں حشو سے بھی بدتر ہے۔"

اقول :- مصرع یوں ہے ۔"کچھ بڑھ کے پھرے جانب قبلہ شہ صفدر" مگر میں مصرع مطبوع کو صحیح فرض کر کے عرض کرتا ہوں کہ بے پر استعارہ ہے۔ مجبور و عاجز سے یا مظلوم و ستمدیدہ سے۔ چونکہ طائر بے بال و پر مظلوم و مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے عموماً مرثیہ گویوں کی اصطلاح ہے۔ ولا مشاحتہ فی الاصطلاح اور معترض نے اعتراض کمال مرزا صاحب میں اس استعارہ کے باب میں تحریر کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ کو کسی جانور پرندہ سے ذہن میں استعارہ کیا ہے۔ انصاف کی جگہ ہے کہ کعبہ کے واسطے ترقی ہوئی یا تنزلی اور کس درجہ کا تنزل اور طرفہ یہ کہ حضرت امام حسین اور دوسرے اہلبیت اطہار کی شان میں جابجا یہ لفظ آیا ہے وہاں کیا کیا جائے گا استعارہ کیا آفت لائے گا۔"

(نشان دلخراش صفحہ ۳۶۹ و صفحہ ۳۶۸)

(۳) لاشے کے منھ کو دیکھ کے کہنے لگے یہ شاہ
بیچارگی کا وقت ہے اصغر خدا گواہ

ماں بہنیں گھر میں باپ یہ یاں نرغۂ سپاہ
یہ ریگ گرم اور یہ بدن نرم آہ آہ
دل ساتھ نکلا پڑتا ہے کیوں کر جدا کروں
سونپوں کسے لٹاؤں کہاں آہ کیا کروں

"خلاصہ مدعا یہ ہے کہ جناب سید الشہدا حضرت علی اصغر شیر خوار شش ماہہ کی لاش گود میں لئے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے علی اصغر یہ نہایت بیکسی و مجبوری کا وقت ہے۔ تمہاری ماں اور بہنیں تو گھر میں اور میں محصور سپاہ ظلم ہوں۔ زمین تفتیدہ و ریگ گرم پر کیونکر تم سے شیر خوار معصوم کی لاش رکھ دوں۔ کس کو سپرد کر دوں۔ اگر ماں بہنیں یہاں ہوتیں تو ان کے حوالے کرتا۔

انتہی:۔ اب فرمائیے بے محل و زاید کیونکر ہوا۔ ہائے ہائے تعصب کیا بری چیز ہے کہ جو بدیہیات اولیہ سے ہے۔ وہ کبھی نظر نہیں آتا۔ اب حضرت نے جو تبدیل و تصرف و خیانت فی النقل کی ہے۔ کسی قدر عرض کرتا ہوں کہ اول تو ٹیپ چھوڑ دی کہ شعر ہونا کچھ تو ظاہر ہو۔ دوسرے حضرت علی اصغر کے نام کے بدلے اکبر لکھ دیا تاکہ جوانی کے سبب سے لاشے کے سپرد کرنے کی حاجت نہ معلوم ہو۔ اس لئے کہ بچہ شیر خوار کو البتہ تنہا چھوڑنا نہیں چاہتے۔ جوان کو تنہائی کا کیا ڈر۔ حالانکہ یہ مرثیہ تمام حضرت علی اصغر کے حال میں ہے۔ اس کا یہ مطلع ہے ؎

"بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے"

کوئی آپ کے فقرے میں آئے گا۔ بیچارے کاپی نویس نے بھی جلدی میں اصغر ہی لکھا ہے۔ آپ نے اس دھوکے کے لئے رسالہ میں اکبر

لکھ دیا۔ پھر ان کے لفظ کو اپنے دیہاتی محاورے کے موافق بدون نون کا لکھا
یہ معلومات کا حال اس پر یہ دیدہ دلیری ہے۔ اب حشو زاید آپ کے کلام سے
عرض کرتا ہوں کہ ایسا حشو کسی نے نہ دیکھا ہو نہ سنا ہو" دستان دلخراش صفحہ ۱۲۱"

(۵) "بانو کے شیر خوار :۔ یہ ان سلیس و فصیح و بلیغ مرثیوں میں سے ایک
ہے، جس کو دیکھ کر منکروں کے بھی سر جھک جاتے ہیں اور مرزا صاحب
کی بلاغت و فضیلت ماننا پڑتی ہے مولوی شبلی صاحب موازنہ میں
جابجا لکھتے آئے کہ مرزا صاحب کے کلام میں بلاغت کا نام تک
نہیں۔ تمام ملک منطقی رہے جو ان کو بلیغ بتاتا ہے مگر اس مرثیہ کے
چند بند لکھ کر لکھتے ہیں کہ تمام واقعات کربلا میں یہ واقعہ اہم و عظیم ہے۔
مرزا صاحب نے جس بلاغت سے اس کو ادا کیا ہے۔ وہ میر صاحب
یا کسی مرثیہ گو سے نہ ہو سکا۔ ناسخ نے گرگٹ کے سے رنگ بدلے۔
اصغر کی جگہ اکبر لکھ دیا۔ مگر منیر نے ان کی خوب قلعی کھولی" (حیات دبیر)

(۴) چلا کے یہ کہتی تھی کبھی زینب و سجاد
۲۔ کونین سے افضل ہے شہنشاہ خوش انجام
۳۔ زنجیر و طوق پہنے تھے سجاد نامدار
۴۔ دیکھو وہ گوش اسپ حر بے نظیر میں
۵۔ ہر ذرہ اس کا اختر خوش روزگار تھا۔
۶۔ کیا کیا کمال رکھتی تھی شمشیر خوش نہاد
۷۔ اے زینب و سکینہ و کلثوم دل فگار
۸۔ پیچھے کو رو رو تے جو سوئی ہیں دل حزیں۔
۹۔ شہ نے کہا یہ ضربت ہوش و حواس ہے۔

۱۰۔ بیمار اب مسیح خوش اطوار ہو گیا۔

"ان میں ذیجاہ، نامدار، بے نظیر، خوش انجام، دل حزیں ہوش و حواس، خوش اطوار کے الفاظ محض حشو ہیں۔ تطویل میں بھی داخل نہیں ہو سکتے بلکہ بعض حشو سے بھی بدتر ہیں۔ سوا اس کے لفظ ذیجاہ، بے نظیر، اسم کے ساتھ دیکھے ہیں۔ اعلام کے ساتھ دیکھے نہیں اور اختر کی صفت خوش روزگار کسی نے لکھی ہیں۔ شمشیر کو خوش نہاد کسی نے نہیں باندھا۔ البتہ نہاد کا لفظ ذوی العقول کے ساتھ اوصاف میں دیکھا ہے۔ دل حزیں کا لفظ فارسی میں نہیں آیا۔"

ان شبہات بوجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اعتراض موافق فن تو ملتا نہیں۔ ادھر ادھر اٹکل پچو ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ ناچاری سے جو کچھ رطب و یابس پاتے ہیں۔ اطناب رسالہ اور ناواقفوں کی تسلی دینے کے لئے حوالۂ قلم کر دیتے ہیں۔ ان اعتراضات میں کوئی قابل جواب نہیں۔ ناچار ہم خامہ فرسائی کرتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ اگر الفاظ مذکور حشو یا حشو سے بھی قبیح تر ہیں تو ہوں۔ ہم نے یا کس مرثیہ گو نے کب دعویٰ کیا تھا کہ ان کے کلام میں حشو نہیں ہے اور وہ کون سا استاد خواہ قدما یا متاخرین میں ہے (لاسیما مثنوی والے) جو حشو سے محفوظ ہو۔" ایک کا نام لیجئے تو اس کا کلام عرض کیا جائے۔" (لسان بیخراش صفحہ ۲۱۶)

(۵) مرثیہ کا مطلع ہے "کس کی زبان سے پیاس نے پائی ہے آبرو"

"تمام مرثیہ بے خلل مشہور اور اس کی نظم درد ... ایسے مضامین عالیہ اور فصاحت سے معمور ہے کہ جواب نہیں بن آتے خدا اس تعصب اور ہنر پوشی و حق فراموشی کو دیکھئے کہ ایک مصرع پر اعتراض کے واسطے

مصرع تو لکھ دیے مگر ٹیپ اسی بند کی جو تشبیہ جدید اور لطافت میں بے نظیر و شہرۂ آفاق ہے حضرت والا نے نہ لکھی۔ اللہ رے تعصب و حسد کہ اور مقاموں پر تو فضول اور بے ضرورت ابیات زائد اور اشعار بے محل محض برائے اطناب لکھ دیے۔ یہاں اخفائے کمال کے لئے اختصار پسند آگیا۔ اب مجھے واجب ہوا یہ بند تمام و کمال اور اس کے بعد کا لکھتا ہوں ؎

کبھی جو خود پہ تو وہ سر میں سما گیا ۔۔۔ سر گردنِ نحس میں معہ خود آگیا
گردن بھی جو سینے میں کی تھرتھرا گیا ۔۔۔ بھاری تھا بوجھ ٹوٹ کے کر پیچ کھا گیا
آنے میں خود سر کے سر ہو تہ بل پڑا ۔۔۔ مانند آبلہ کف پا سے نکل پڑا

برائے خدا ٹیپ کے مصرعِ ثانی کو دیکھیئے کہ یہ مضمون کرامت سے کم نہیں

ایک بند اور دیکھیئے۔

ناگاہ ذوالفقار نے کی صلح جنگ میں
مغفر سے تھی زرہ میں تو پاکھر سے تنگ میں
صیقل تھی جا آئینہ میں پھل خدنگ میں
پانی کی طرح مل گئی ہر ایک رنگ میں
تھی غرق خون میں ڈاب سے لے پر تلے تلک
قطرہ نہ تھا آب تیغ مگر تھا گلے تلک

ارباب مذاق و اہلِ انصاف و ادراک جانتے ہیں کہ مصرعِ آخر میں کیا مضمون کہا ہے اور ایسے ہزارہا مضامین مرزا صاحب کے کلام میں ہیں۔ کچھ مفت اور بلا سبب نام وری نہیں ہوئی جلنے والے جلا کیے اور جلیں گے۔ ان دونوں کے مرتبے نہ گھٹے ہیں نہ گھٹیں گے۔

(سنان دلخراش صفحہ ۲۲۲، ۲۲۳)

(۶) قولہ :- گل ہے چراغ چشم ثریا مثال کا
ماتھا نواں فلک ہے تکوہ و جلال کا

"اس شعر میں چشم کو ثریا لکھا ہے یہ کیسی تشبیہ ہے اگر چشم کو ثریا کہیئے تو آنکھ معیوب ہوئی جاتی ہے۔

اقول :- معلوم ہوا کہ بایں ہمہ دانی حضرت مرثیہ کے ہر شعر کو غزل کے ہر شعر کی طرح سمجھے ہوئے ہیں کہ اس شعر کا مدعا اسی میں تمام ہے۔ حالانکہ نادان نافہم نہیں جانتے کہ مرثیہ گو یا مثنوی گو ایک مدعا دس دس بیس بیس بلکہ پچاس، پچاس بندوں میں اور ابیات میں تمام کرتے ہیں۔ حضرت نے جلد بازی کے مارے جو شعر اپنے واہمہ کے موافق مخدوش پایا! سیاق، سباق، اول آخر کچھ نہ دیکھا فی الفور تخطیہ کر بیٹھے۔"

منیر نے جو کچھ لکھا ہے حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی خداداد نابلیت کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے۔ دلائل پیش کرنے میں وہ کہیں پیچھے نظر نہیں آتے ہیں۔ بلا وجہ کی ٹھونس ٹھانس سے کام نہیں لیا ہے۔ علمیت اور نابلیت کی لاجواب مثال اس کتاب میں موجود ہے جہاں تک الفاظ اور زبان کا تعلق ہے۔ منیر کو پوری مہارت حاصل تھی۔ اور اس کے استعمال میں پوری احتیاط سے کام لینا ان کے نظریہ شاعری کا جزو لاینفک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ اعتراض جس کا تعلق زبان اور زبان دانی سے تھا۔ اس کا جواب انھوں نے بے مثال دیا ہے حسب ذیل مثال سے ان کا ماہرانہ کمال پوری طرح ظاہر ہو جائے گا۔

قولہ ؎ غربت میں جو متغیر تھا اور حلق میں تشنگی اور فاطمہ کا صبر تھا اکبر میں اسـ ـ ـ ـ اسر

"غربت بہ تواضع اور فروتنی کے معنوں میں نہیں ہے جیسا کہ مرزا صاحب نے قیاس کیا ہے۔ بلکہ بمعنی مسافرت کے لئے جائیں تو خلق و صبر سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے دونوں معنی اس جگہ صحیح ہیں۔ کچھ نقص نہیں۔ صرف حضرت کی رائے دور غیظ و غضب سے اصابت پر نہیں ہے۔ یہ عربی لفظ ہے اردو میں دوسرے طور پر مستعمل ہو گیا جیسے صحبت کے عربی میں اور معنی ہیں۔ ہمارے محاورے میں اور۔ ریاض کے اصلی معنی اور ہیں اور ہمارے محاورے میں اور۔ ہم سب علی العموم غربت کو بمعنی حلم و مسکنت و تواضع اور غریب کو محتاج اور بے شر حلیم۔ متواضع کی جگہ بولتے ہیں۔ غریب کو مسافر کے معنی پر بھی کہیں بول جاتے ہیں۔ اس کو غریب الوطن کہتے ہیں۔ مسافرت کو اگر غربت کہیں گے تو کوئی اور لفظ مترادف المعنی اس کے ساتھ لائیں گے۔ ابھی بے دیاری کے معنی پر ہمارے محاورے میں بکثرت نہیں ہے اگر کوئی شاعر احیاناً غربت کو بمعنی سفر یا غریب کو مسافر کے معنی پر نظم کرتا ہے تو اس کے لوازم اور مناسبات و مویدات کا ضرور ذکر کر دیتا ہے۔ دیکھئے حضرت تجر مرحوم نے دونوں طرح پر کہہ کر اس مدعا کو بخوبی اظہار کر دیا ہے۔ بمعنی "مسافر" اس شعر میں

ع

سنتا ہے کون قافلہ میں نالۂ جرس
شور فغاں ہے بادہ پیمائی غریب کا

اور بمعنی مسکین مجبور محتاج کے اس میں ؎

ساقی سے کوئی کہہ دے کہ اتنا رہے خیال
نازک ہے شیشہ سے بھی سوا دل غریب کا

اسی طرح آتش نے بھی کہا ہے ؎

اللہ کے ہر اثر کسی نے کبھی سنا
نالہ مرا غریب کی نصرت یاد ہو گیا

(سنان دلخراش صفحہ ۲۵۰، صفحہ ۲۵۹)

یہ تو سلسلہ تھا ان جوابات کا جو دبیر پر اعتراض کئے گئے تھے۔ اسی طرح انیس پر بھی ناسخ کے اعتراض ہیں۔ چنانچہ منیر نے ان کے بھی جوابات دئے ہیں چند اعتراضوں کے جوابات لکھے جاتے ہیں:

(۱) قولہ ؎ اے نہر علقمہ میرا بچہ ہے بے گناہ
اے نہر بے وفا مرا بچہ ہے بے گناہ

" اسی طرح نہر علقمہ اور بے وفا کا قافیہ بھی جائز نہیں۔

اقول اول :۔ حضرت خاقانی ہند اور ان کے معتقدین بلکہ تمام اہل دہلی کہ جن کے آپ مداح ہیں۔ قائل و مجوز کر لیجئے۔ ان سے اقرار نامہ عدم جواز قوافی کذائیہ و تخطیہ حضرت ذوق لکھوا لائیے۔ پھر مرثیہ گویوں کو چھوڑ دیئے۔ سبحان اللہ سب باتوں میں شعرائے دلا یسما ناسخ مطعون اور ان قواعد مسلم بلکہ مستند و مقتدا۔ ان ہذا لشئ عجب (یہ عجب بات ہے) اور جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ بشہادت امیر عالیشان کہ اجل تلامذہ میر صاحب سے اور تہذیب وضع و صدق گفتار و عالی خاندان میں شہرۂ آفاق اور حکام میں نیک نام اور مرثیہ گوئی میں مقبول و ممدوح کرام ہیں۔ یہ مرثیہ میر صاحب کی تصنیف صرف اس ٹیپ تک ہے۔" (سنان دلخراش صفحہ ۳۱۰)

(۲) میں یہ کرتا تھا اشارہ کہ نہ اے بھائی جان
رحم لازم ہے ہمیں ہم ہیں امام دو جہاں

عباس سے یہ کہنے لگے شاہِ دوجہاں
تم جا کے اس عرب کو بلا لاؤ بھائی جاں

گردن سے لپٹ کر وہ جو کہتی تھی چچا جاں
یہ کہتے تھے عمو تری آواز کے قرباں

"ان شعروں میں لفظ بھائی جان اور چچا جان کا بغیر اعلان نون کے آیا ہے۔ حالانکہ یہ الفاظ کسی کی زبان پر بغیر اعلان نون کے نہیں آتے ہیں اور اگر ان الفاظ کو باعلان نون پڑھیے تو ان کا قافیہ امام دوجہاں اور شاہِ دوجہاں اور سرورِ ذیشاں کے ساتھ درست نہ ہوگا۔ چنانچہ اس کا اوپر ذکر گزر چکا ہے۔

اقول:۔ جی ہاں اوپر گذر چکا ہے۔ اس کے جواب کا قافلہ بھی وہیں اتر چکا۔ خلاصہ اس عبارت سے معلوم ہوا کہ آپ کے نزدیک زبان کی مطابقت نظم میں بہت ضروری ہے۔ اگرچہ اس کا جواب سابق میں مذکور ہو چکا ہے۔ لیکن آپ نے بار بار جو ایک ہی اعتراض کیا ہے تو ہم کو بھی تکرار سے چارہ نہیں۔ اب اس کا مزہ پھر دیکھیے کہ اساتذہ دہلی و لکھنؤ بلکہ تمام شعرائے اردو نظم میں مطابقت زبان کے کس قدر پابند ہیں۔ خصوصاً حضرت والا کہ اپنے زعم میں افضل اولین و آخرین اس فن میں ہیں۔ اس لئے کہ شعرائے لکھنؤ یا لکھنؤ کی کسی بات میں آپ نے تعریف نہیں کی بلکہ کنایتہً و صراحتہً تعریض و تشنیع و تحقیر ہی کی۔ لہذا میں شعرائے لکھنؤ کے اشعار سند میں بہت کم لایا ہوں۔ ہاں اساتذہ دہلی بلکہ تمام دہلی کے آپ مداح و معتقد جاں نثار دیوان سوم میں ہوئے ہیں اور جوشِ عقیدت میں نواقص کلام کی بھی پروا نہ رہی کہ دیباچہ دیوان اول میں دہلی کی زبان کو لکھنؤ کے برابر

بکمزہ ثقیل سامعہ خراش قرار دیا ہے تو اشعار اہل دہلی ہی سند میں عرض کرتا ہوں۔ اس قسم کی بندشیں اساتذہ دہلی اعنی اپنے ممدوحین کے کلام سے سنئے مگر سب ناظرین کی خدمت میں حضرت کے سوا التماس ہے کہ اس نقل اشعار سے معاذ اللہ طعن و تعریض یا اعتراض مقصود نہیں اور کیوں کر اعتراض کروں۔ جب ایک ہی لانگ میں سب کے سب رنگے ہوں۔ ہاں اگر لکھنؤ کے شعر میں وہ باتیں نہ ہوتیں تو البتہ اعتراض کر سکتے تھے"۔

"مرثیہ گو تو بدرجہ اولی معفو و معذور ہیں۔ اس قسم کی باتوں پر اعتراض کرنے والا خود اپنے کلام پر اپنے نفس پر اور سب پر معترض ہے کس مصلحت سے اور وں کا نام نہیں لیا۔ مرثیہ گویوں کو بے کس و بیکس سمجھ کر جانا ہے۔ لہٰذا ان کو چھوڑ کر ان کی زبان سے سب کو برا کہلانا ہے۔ واضح ہو کہ جان اور اس قسم کے الفاظ میں اخفائے نون اکثر شعرائے لکھنؤ کے کلام میں موجود ہے۔ جب یہ عذرات صحیحہ معروض خدمت ہو چکے تو اب سنئے ذوق فرماتے ہیں ؎

جس انسان کو سگِ دنیا نہ پایا

دیں گے جان کو بوسۂ لعل نمکین پر ہم بھی

ورنہ خوں ہو کے میں آنکھوں سے نکل جاؤں گا

منظورِ نظر ایک حسیں ہو ہی چکا تھا

ع جاں ہوا یوں ہوئی اس خال کا بوسا لے کر

حضرت مومن۔

تمھارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا

ناصح کی زبان سے نہیں پیغام نکلتا ۔

حضرت غالب :-

ع :- خوں کیا ہوا ۔ دیکھا گم ہوا پایا

وحشت سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا ۔

"اب اتفاق ہو کہ انسان، حسین، جاں، خوں، جاں، بیاں، زباں، مکان وغیرہ کو نون باخفائے نون بولتا ہے۔ جب لکھنؤ اور دہلی کے اعاظم شعرا نے اتفاق و اجماع کر لیا کہ ان الفاظ و امثالہا کو با اعلان و اخفائے نون دونوں طرح نظم کرنا چاہیئے۔ مخالفت زبان و منافات روزمرہ کی کچھ پروا نہ کی۔ تو مرثیہ گویوں پر بھائی جاں، چچا جان وغیرہ کہنے پر کیا الزام دے سکتے ہیں۔" (لسان دخراش صفحہ ۳۱۸، صفحہ ۳۲۱)

اس کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تنبیر کی معلومات وسیع تھی۔ مرثیہ میں کوئی مقام نہ ہونے پر بھی فن مرثیہ پر عبور تھا۔ چونکہ انیس و دبیر کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ شاید تنبیر نے ان پر جو اعتراضات ہوئے ان کو لکھنوی شاعری پر بھی اعتراض خیال کیا ہوگا۔ کیونکہ اعتراضات کے جوابات میں مثالیں تمام تر دہلوی شعرا کی پیش کی ہیں مثلاً تنبیر لکھتے ہیں :-

(۱) قولہ ع :- فرزند کو جلانے لگی زینبؑ ذی جاہ

سن کر یہ سخن کہنے لگی زینبؑ ذی جاہ

مور ضعیف و مدح سلیمان ذی حشم

کس شان سے گھوڑے پہ چڑھے قاسم ذی شاں

آئے تو رخ اکبر ذی قدر کو دیکھوں

گردن سے لپٹی کہتی تھی بانوئے نامدار

"ان میں ذی جاہ، ذی حشم، ذی شان، ذی قدر، اور نامدار کے لفظ حشو ہیں۔ ان الفاظ کا استعمال اسما کے ساتھ دیکھا ہے۔ اعلام کے ساتھ دیکھا نہیں۔

اقول:- آپ تو دو مصرع بھی حشو سے خالی نہیں کہہ سکتے اور دوں پر طعن فرماتے ہیں (حشو و زائد سے کسی شاعر کا کلام کا نا من کان رحا ہیئے وہ کوئی ہو) محفوظ تباد سمجھئے تو پھر اس کا حال ظاہر کیا جائے۔ مشتے نمونہ از خروارے دیکھئے حضرت مومن مثنوی قول غمین صفحہ ۳۰ چھاپ مطبع ہاشمی میرٹھ میں فرماتے ہیں:-

جب سفر قافلہ شب نے کیا کوچ ہر اختر و کوکب نے کیا

اختر و کوکب قابل ملاحظہ ہے پھر اپنی مثنوی شاہد عشرت کو ملاحظہ کیجیے کہ ایسی مختصر بحر میں کیا کیا حشو و اغلاط نے جگہ پائی ہے صفحہ ۸ پر ہے

"ہیں حلقۂ دام سحر و جادو" (اس میں ایک لفظ زائد ہے)

"وہ شش ہے وہ نا پشت دست بکبیر" (بکبیر کا لفظ حشو محض ہے صفحہ ۹ پر)

"ہیں ناخن عاق باکہ اے دل (اے دل کیا ہے اگر حشو نہیں ہے)

اس مثنوی کو اگر کوئی دیکھے تو ایک بیت ایسی نہ پائے جو مذاق کی بندش اور زبان سے موافق ہو حسن تلاش تو شاید ایک آدھ جگہ عیب بینی کو نظر آجائے مگر زبان کی منافات ترکیب موحش، کراہت قوافی اور عجز طبیعت اور تخفیف الفاظ فارسیہ اور استعمال خلاف ما اجمع علیہ المحققین (محققوں کی اجماع کے برخلاف) تو وہ پائے گا پھر اس پر آپ کو ناز و فخر ہے" (سنان دل خراش صفحہ ۳۴)

(۲) قولہ ع " بانہیں جو گلے میں تھیں تو سبد دیدۂ خونبار"۔

اس مصرع میں بند دیدہ کے لفظ سے ایک دال تقطیع میں گر جاتا ہے یہ درست نہیں۔

اقول:۔ ایسے توہمات میں حضرت آپ ہی منفرد رہیں گے کہ جو کاتب نے لکھ دیا وہ حق الیقین ہوگیا۔ مثلاً عبداللہ حج کے سفر میں ہے تو آپ پڑھیں گے عبداللہ نج کے سفر میں ہے۔ ہزاروں طرح کے سہو کاتب اور غلط ناسخ آتش۔ ذوق۔ مومن۔ غالب کے کلام میں ہے۔ ان سے تعرض نہیں۔ صرف مرثیہ کہنا ایسا گناہ ہے کہ الوف مطاعین کے مقابل ہے سبحان اللہ میر صاحب اس قدر مدت کی مشق پر دال کا گرنا اور مصرع کا ناموزوں ہونا بھی نہ جانتے تھے اور نہ ان کے کسی بھائی خصوصاً مونس مرحوم نے کہ شاعر (غزل گو) بھی تھے۔ نہ ان کے خلف اکبر اور نہ سامعین نے اخلاص کی راہ سے ان کو آگاہ کیا۔ نہ شعرا میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ ان کے اقرباخواہ تلامذہ بدل دیتے۔ خاص کر اس مرثیہ میں کہ مدتوں سے مشہور اور ہزاروں بار مجالس میں سنا گیا۔ صرف اس کے اعتراض کے لئے یہ عیب ناحق سب کی نگاہوں سے مستور رہ گیا حضرت اصل مصرع یہ ہے:۔

ع۔ " بانہیں تو گلے میں تھیں سند سے دیدۂ خونبار"

آپ نے دال کو مذکر کر کے جو تعبیر فرمایا۔ اہلِ دہلی کے تو مطلق خلاف ہے۔ حضرت غالب کی رباعی جس کا شعر آخر یہ ہے:۔

بر شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

دیکھئے لکھنؤ کے جملہ اساتذہ کا اس پر اتفاق ہے۔"

(لسان دیخراش صفحہ ۳۹۹)

(۳) قولہ :- "لشکر کے زرہ پوشوں نے گھوڑے کے لئے تنگ۔"

اس میں جو گھوڑوں کے تنگ کا فقرہ واقع ہے۔ یہ سراسر محاورے سے خارج ہے۔ البتہ گھوڑوں کی باگیں لیں یا لگامیں لیں بولتے ہیں۔ گھوڑوں پر تنگ کسا اور باندھا کہا جاتا ہے۔"

اقول :- ہائے ہائے کس نامنصف کا سر پھوڑے اور کس اندھے کے سامنے رو رو کر اپنی آنکھیں کھوئے کہ میر انیس سے شخص کہ ابّاً عن جدٍّ دہلی و لکھنؤ کے رہنے والے کئی پشت کے شاعر فصاحت و محاورہ دانی میں شہرۂ آفاق وہ تو محاورہ نہ جانیں اور حضرت مخاطب اقصائے بلاد شرقیہ کے رہنے والے جہاں کے فرمانروا لئے نامی کی زبان اردو اب تک عماد السعادۃ میں مسطور اور ہر صحبت میں مذکور تو ہے۔ آپ کے ممدوح و مقتدا حضرت مومن نے دیوان چھاپ میرٹھ کے صفحہ ۵۳ میں جو فرمایا ہے ؎

ہو صورت خاک جی لگنے کی جنت میں بھلا مومن
مری نظروں میں ہے شاہ جہاں آباد کا نقشہ

"یہ شاہ کی اضافت کس قدر خلاف محاورہ و منافی معنی ہے۔ یہ ترکیب ایسی ہے جیسے کوئی شخص جہانگیر آباد کو نظم میں یوں کہے۔

ع " یہ قصبہ ہے جہانگیر آباد "

ہائے ہائے شاہ جہاں آباد کا نام اس طور سے کوئی جاہل بھی نظم نہ کرے گا۔ اس پر ہمارے مخاطب ان کے نصیری و مداح ہیں۔ خلاصہ

میر صاحب نے کیا عجب ہے کہ رب ذوالکرام کی جگہ خالق انام کہا ہو یا
ذوالکرام کہہ کر بدل دیا ہو۔ اس مقام کی تحریر کے بعد میر صاحب کے اکثر تلامذۂ
نامی نے بالاتفاق لکھنؤ، جونپور، الہ آباد وغیرہ سے لکھا کہ مصرع اس طرح ہے

ع " ہو مغفرت خلیق کی یا خالقِ انام "

(۴) قولہ :- دم بدم چاہنے والوں کے لہو گھلتے ہیں
یہ گلا وہ ہے گلے جس کے لئے کٹتے ہیں

" اس شعر میں لہو کا لفظ بصیغہ جمع مستعمل ہوا ہے یہ کہاں کا محاورہ
ہے اس کی سند چاہیئے "

اقول :- یہ وہاں کا محاورہ ہے دیوان اول صفحہ ۹۱ میں جہاں محاورہ یہ کہا
گیا ہے

ع " ہوئی ہے تیداب ان سیب پیش رس میں روح "

جہاں ان سیبہائے پیش رس کی جگہ ان سیب پیش رس کہتے ہیں
مثنوی شاہد عشرت صفحہ ۸ میں :

ہیں نازک و نرم ہاتھ ایسے دل عاشق بادنا کے جیسے

ایک عاشق کے جہاں بہت سے دل ہوتے ہیں یہ وہاں کا محاورہ
ہے اور دیوان اول صفحہ ۴۳

ع نہیں ہوتا کبھی شانہ سے سیدھا بال کاکل کا

جہاں ایک بال کی کاکل ہوتی ہے اور جہاں ایک بال میں کنگھی کی
جاتی ہے یہ وہاں کا محاورہ ہے۔

ع :- بلبل کے دلوں میں ہوئی گلزار میں شورش

بلبل واحد کے بہت دل قرار دینا جہاں کا محاورہ ہے وہیں کا محاورہ

میر صاحب نے بھی کہا ہے، واضح ہو کہ یہ مصرعے جن میں جمع یا افراد کو اس طور سے خود بدولت نے موزوں کیا ہے۔ یہ باتفاق لکھنؤ و دہلی مخالف محاورہ اردو ہے۔ جمع جس پر حضرت کلام کرتے ہیں۔ اس طرح کی جمع اکثر شعرائے اردو کے کلام میں ہے۔" (زبان دلخراش۔ صفحہ ۳۵۵، ۳۵۶)

پوری کتاب کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کے پاس الفاظ کا خزانہ تھا۔ البتہ اس کتاب میں مذہبی رنگ جھلکتا ہے کیونکہ کہیں کہیں پر منیر نے جوابات سختی سے پیش کئے ہیں۔ اور یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا تعلق شیعہ مذہب سے ہے۔ اس کتاب سے منیر کا نظریہ شاعری بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے۔ گو کہ وہ ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے مشہور نہیں رہا۔ پھر بھی انھوں نے زبان دلخراش سے یہ ثابت کر دیا کہ اگر منیر صنفِ مرثیہ کو اپنی مشقِ سخن کے لئے مخصوص کر لیتے تو آج انیس و دبیر کے ہم پلہ ہوتے۔

منیر نے صنفِ مرثیہ میں صرف دبیر کی صحبت کے اثر سے طبع آزمائی کی اور مرثیہ میں انھیں کے شاگرد ہوئے جیسا کہ خود منیر نے مثنوی معراج المضامین کے دیباچہ میں تذکرہ کیا ہے:-

عطا کی مرثیہ میں اس کی اصلاح — کہ جس کی بزم ہے خورشید مصباح
مسیحائے سخن اعجاز گستر — دبیر پاک دیں مقبول داور
چلے جب تک نسیم صبح گاہی — سلامت ان کو رکھنا یا الٰہی

منیر نے مرثیہ کہے مگر انھوں نے ان کو نہ تو کلیات میں شامل کیا اور الگ چھپوائے صرف افضل حسین ثابت اپنی تصنیف "دربار حسین" میں صرف دو مراثی کا ذکر کرتے ہیں، جن کے مطلع حسب ذیل ہیں:-

۱۔ مشہور جہاں خاک شفا خاک ہے کس کی

۷۔ جب مصحفِ اعجاز کے ٹکڑے ملے ہوئے ان میں

ان دو مرثیوں میں سے پہلے مرثیہ کی تفصیل ملتی ہیں۔ مگر دوسرے مرثیہ کے متعلق کوئی تفصیل نہیں مل سکی ہے۔ پہلے والے مرثیہ میں کل ۹۱ بند ہیں اور پورا مرثیہ "دربارِ حسین" نام کی کتاب میں شامل ہے۔ اس کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا ہے کہ میر کے مرثیوں کو کلیات میں کیوں نہیں شامل کیا یا الگ کیوں نہیں چھپوائے۔ کچھ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ میر نے مرثیہ کے میدان میں اپنے کو دوسرے شعراء سے کمتر خیال کیا ہوگا۔ کیونکہ یہ زمانہ مرثیوں کا زریں دور تھا اور انیس و دبیر کے مقابلہ پر نہیں رکھے جا سکتے تھے۔ میر کو مرثیہ کہنے کی عادت نہ تھی بلکہ مرزا دبیر کی صحبت نے ان کو اس صنفِ سخن کی طرف متوجہ کیا جیسا کہ انھوں نے خود اپنے مرثیہ کے آخر میں لکھا ہے:۔

خاموش میر اب کہ اٹھا شور قیامت
اس نظم کا دیں تجھ کو صلہ شاہِ ولایت
ہر چند کہ تھی مرثیہ گوئی کی نہ عادت
استاد کے صدقے سے یہ حاصل ہوئی دولت
محظوظ و خوش و خرم و آباد سلامت
یا رب رہے دائم مرا استاد سلامت

مرثیہ نگاری میں دبیر کی شاگردی نے میر کے مزاج میں روایت پرستی اور شوکت الفاظ کا شوق مزید کر دیا ہے اور ان کو استاد دبیر کی باوقار صنعت طرازی اور شکوہِ الفاظ کی طرف متوجہ کر دیا۔ ان کے مزاج میں دبیر کی طرح سے دقت پسندی پائی جاتی ہے۔ چونکہ میر کو خود کوئی خاص دلچسپی اس صنفِ سخن سے نہ تھی۔ اس لئے ان کے مزاج

میں وہ اہتمام اور روایتی اجزائے ترکیبی نہیں پائے جاتے ہیں۔ جن کی پابندی ضمیر، فصیح اور بعد کو انیس و دبیر نے کی ہے۔ منیر کے مرثیہ میں واقعہ نگاری اور بین بلند پایہ، پُراثر اور معیاری پائے جاتے ہیں۔ ان کا جو مرثیہ "دربار حسین میں ہے اس کے معیار کو واضح کرنے کے لئے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں ؎

(۱) مشہور جہاں خاک شفا خاک ہے کس کی
امراض مسیحا کی دوا خاک ہے کس کی
اور بہر غنچہ آب بقا خاک ہے کس کی
سب ایک طرف نور خدا خاک ہے کس کی
کس خاک کے ذرّہ سے یہ پُر نور جہاں ہے
کس خاک میں اللہ کا خورشید نہاں ہے

(۲) نصرت الف نیزہ کی تھی تاک سے تا تاک
انگلی سے گرہ کھولتا تھا نات کی وہ صاف
کیا پیچ میں تھا نات کے شکل الف ناف
قائم کبھی مابین جگہ تھا صفت کاف
پھل نیزے کا جس وقت میان کمر آیا
پھر کاف کمر کا یہی مرکز نظر آیا

(۳) بھالے جو سنبھالے ہوئے تھے تمام لشکر
نیزے پہ اٹھالے گئے اکثر صفدر
اک راکب مرکوب تھے نیزے میں برابر
جس طرح کباب آئے نظر سیخ کے اندر

ہر قطرۂ خون غنچے کی تصویر بنا تھا
پھولوں کی چھڑی نیزۂ شبیر بنا تھا

(۴) اس نے کہا یہ بیچی جو ردتی ہے بلاؤ
پانی مرے ہمراہ ہے چھاگل میں پلاؤ
چلائی سکینہ کہ نہ یہ بات سناؤ
پانی کا نہ لو نام خدا کے لئے جاؤ
منھ حشر کے دن کیا میں دکھاؤں گی خدا کو
غربا ہے پانی میں بیہوں کھو کے چچا کو

(۵) اللہ رے فیض قدم وارث حیدر
اندام زمیں ہفت تجا سے ہوا باہر
ہاتھوں میں لئے کاسۂ خورشید منور
دریوزہ گر نور ہیں عیسیٰ خوش اختر
نور نظر حور کا چہرہ نظری ہے
جو خاک ہر جگہ زمن قمر گاہ پری ہے

## ہماری شاعری میں میر کا مقام

میر کا اپنے ہم عصر شعرا میں کیا مقام ہے اس کو سمجھنے کے لیے ان کا صحیح طور پر مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ میر نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور صرف نظم ہی نہیں نثر میں بھی خامہ فرسائی کی۔

زمانے کے مذاق کے مطابق شاعری کے میدان میں میر نے غزل گوئی کی وساطت سے پہلا قدم رکھا۔ غزلیات کے تین دیوان موجود ہیں جو مختلف ادوار کی یادگار ہیں پہلے دیوان میں غزلیات کا رنگ کچھ اور ہے دوسرے کا کچھ اور۔

تیسرے کا ان دونوں سے مختلف ہے۔ اگر شروع میں لکھنویت کا اثر منیر کے یہاں ملتا ہے۔ تو آخر میں رامپور جا کر لکھنؤ اور دہلی کا ملا جلا ایک عجیب رنگ شاعری کا ہو جاتا ہے۔ غدر کے اثرات سے لکھنؤ و دہلی کی محفلیں اُجڑ ضرور گئیں مگر ساتھ ہی لکھنؤ میں اُردو غزل جس تنزل کی طرف جا رہی تھی۔ اس کو روکنے کا کام سیاسی اور سماجی انقلابات نے کیا جو اس وقت رونما ہو رہے تھے۔ نظم نثر دونوں کے اندازِ بیان میں تبدیلیاں ہوئیں اور قدیم روش سے ہٹ کر نئے راستوں پر چلنے کا شوق ہر طرف ہوا۔

امیر، داغ اور جلال کے ساتھ منیر شکوہ آبادی بھی کاملانِ فن میں شامل تھے اور دربار رام پور میں خاص اعزاز رکھتے تھے۔ رام پور میں انھوں نے جو غزلیات کہیں۔ ان کا رنگ سنجیدہ تر اور پہلے دو دیوانوں سے کسی قدر مختلف ہے۔ منیر غزل گوئی میں اپنے ہم عصر شعرا سے پیچھے نہیں رہے۔ جہاں بھی گئے ان کی قدر و منزلت ہوئی۔ ان کی زندگی کا آخری زمانہ کسی قدر سکون و اطمینان کے ساتھ رامپور میں گذرا۔ رام پور میں جس قسم کے اہلِ کمال جمع تھے اور جس قسم کی علمی و ادبی صحبتیں عام تھیں۔ ان کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:-

"نواب کلب علی خاں کا دور پُرسکون تھا۔ اس لئے علما میں سے مولوی عبدالحق خیرآبادی، مولوی سعد اللہ صاحب، مولوی مسیح الدین، مولوی بدرالدین صاحب، مولوی ریاض الدین صاحب، مولوی عبدالعلی صاحب۔ مولوی ولی محمد جان بسمل وغیرہ شعرا میں منشی مظفر علی اسیر، منشی امیر مینائی، نواب مرزا خاں داغ دہلوی، جلال لکھنوی، منشی سید اسماعیل منیر شکوہ آبادی، شیخ امداد علی بحر، خواجہ ارشد علی

غالب ذوق، منشی امیر اللہ تسلیم، مرزا رحیم الدین حیا اور لال گنج
بہاری لال حیرت وغیرہ اور خوشنویس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ اہل
کمال ان کے دربار میں شریک ہوتے تھے اور دربار سے
متعلق تھے"۔ ۹۰؎

منیر کی ہمہ دانی اور انفرادیت کا اندازہ اس سے بخوبی ہوتا ہے کہ انکے یہاں اپنے استاد ناسخ اور رشک کے علاوہ اپنا خاص رنگ بھی غزل میں موجود ہے۔ اگرچہ شروع میں لکھنویت کا اثر چھایا ہوا ہے۔ لیکن ان کے اس قسم کے اشعار کی بھی تعداد غیر معمولی طور پر کافی ہے جو خالص لکھنوی رنگ سے بالکل علیحدہ ہیں۔ مذہبیت بھی اگرچہ لکھنؤ کی ایک خاص خصوصیت ہے۔ جس نے مرثیوں میں بیشتر اپنا رنگ دکھایا ہے۔ لیکن منیر کے یہاں غزلوں کے مقطعوں میں بھی اس رجحان کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں اور ان کے مقطع اکثر و بیشتر اخلاقی مضامین یا مذہبی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں :

نزع میں بھی قبر میں بھی دیکھ لینا اے منیر
مرشد روح الامیں مولا علی پیدا ہوا

پہنچا دے ہند سے جو مدینہ میں اے منیر
یہ بات ہے عنایت خالق سے دور کیا

منیر کی شاعری کی قدر و منزلت متعین کرنے کے لئے صرف غزلوں کا مطالعہ ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ ان کے قصائد، مثنویات، تاریخی قطعات وغیرہ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ جہاں تک ان کے قصائد کا تعلق ہے۔ اس میں امرا و روسا کے قصائد کے علاوہ مذہبی قصائد بھی شامل ہیں۔ آئمہ کرام و بزرگان دین

۹۰؎۔ ۱۸۵۷ء کے غدار شعراء۔ امداد صابری صفحہ ۱۵۷

کی تعریف میں مذہبی قصائد ہیں اور خود اپنے حالات زندگی اور حالات روزگار کے واقعات بھی اس میں بیان کئے ہیں وہ اپنے زمانے کے شعرا میں بہترین قصیدہ گو مانے جاتے ہیں۔

غزل اور قصیدہ کے علاوہ مثنوی بھی کہی ہے۔ ان کی دو کامیاب مثنویاں بھی موجود ہیں جن کا انداز بیان اپنے موضوعات کے لحاظ سے بہت مختلف ہے۔ ایک کا تعلق سماجی و اخلاقی حالات سے ہے اور زینت اور تہذیب نسواں کی ذمہ داریوں کو نمایاں کرتا ہے۔ اور دوسری کا تعلق مذہبیات سے ہے۔ جس میں ائمہ کرام کے معجزات کے تذکرے کئے گئے ہیں اور محن شعر گوئی کے کمال کو اچھی طرح ظاہر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں رباعیات اور قطعات کی کافی تعداد ان کے دیوان میں ملتی ہے۔ جو ان کی ذہانت طبیعت کی رنگارنگی اور تاریخ گوئی سے فطری دلچسپی ظاہر کرتی ہے۔

وہ ایک بافیض، ماہر فن اور مسلم الثبوت شاعر تھے۔ منیر کے جملہ کمالات پر نظر رکھتے ہوئے بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک سخنہ کار وسیع المعلومات، پرگو، ماہر فن اور ہر دل عزیز ادیب و شاعر تھے۔ صرف ادیب و شاعر ہی نہیں بلکہ وہ داستان گو بھی تھے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے۔ ان کی قوت متخیلہ اس قدر تیز اور بلند تھی کہ جس کی بنا پر انھوں نے اس داستان (طلسم گوہر بار) کو قلم بند کیا۔ اس داستان میں جو رسم و رواج انھوں نے پیش کئے ہیں ان کا تعلق براہ راست لکھنؤ سے ہے بقول عظیم صاحب:۔

"جو داستان گو دہلی کے مذاق سے متاثر ہیں انھوں نے بیان میں سادگی، فصاحت اور سلاست کو اپنا شیوہ بنایا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جن داستان گویوں پر لکھنوی ماحول اور مزاج کا اثر ہے

تصنع رنگینیٔ بیان اور عبارت ان کے طرز کی نمایاں خصوصیت ہے"۔[۱۴۰]

"طلسم گوہر بار" ایک اردو کی داستان کی کتاب ہے۔ رامپور کی لائبریری میں قلمی کتابوں کی فہرست میں شامل ہے اور بہ حفاظت رکھی ہوئی ہے۔ چونکہ اس کی طباعت نہیں ہوئی اس وجہ سے منیر کی تصانیف میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا ہے اور بالعموم لوگ اس سے ناواقف ہیں۔ کتاب کے بغور مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ داستان اکیس محرم ۱۲۹۴ھ مطابق ۶؍ جنوری ۱۸۷۷ء کو پایۂ تکمیل کو پہونچی اور تقریباً دو ماہ بعد ۴؍ مارچ ۱۸۷۷ء کو نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور کی خدمت میں پیش کی گئی۔ کتاب فل اسکیپ سائز کے چار سو چوہتر صفحات پر مشتمل ہے۔

اس داستان کو پڑھ کر ان کے تخیل کی رفعت، بلند پروازی اور علوئے فکر، تصور کی ندرت اور جدت طرازی کا کرشمہ سامنے آتا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نثر نگاری کے میدان میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔

## منیر کی اہمیت و عظمت

شاعر یا ادیب کی عظمت اس کے کارناموں کی بنا پر ہوتی ہے۔ چنانچہ ان تمام خوبیوں اور خصوصیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، جن کا تذکرہ مختلف مواقع پر کیا جا چکا ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ منیر کا اردو شاعری میں ایک بلند مقام ہے اور وہ اپنے معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کی قدرتی ذہانت و لیاقت، اور خداداد قابلیت کا اندازہ ان کے کلام کو دیکھ کر ہو جاتا ہے شاعری ایک ایسی پیاری دلہن ہے جو بہتر نازک خیالوں کے خوشنما زیوروں سے سجائی

---

۱۴۰ - ہماری داستانیں، سید وقار عظیم صفحہ ۲۲

جاتی ہے کیونکہ جس وقت ہم مضمون آفرینی کے پردے میں نئی نئی تشبیہیں واستعارے اور نئی نئی ترکیبیں دیکھتے ہیں تو خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ یہی چیز منیر کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

منیر کا مرتبہ اس زمانے کے شعرا میں بہت بلند ہے۔ اشعار میں بلند پروازی اور ندرت تخیل ہے اور ان کی مقبولیت عام کا یہ عالم ہے کہ ہر محفل و مجلس میں ان کا کلام پسند کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں چند واقعات ملاحظہ ہوں۔ جن کی تفصیل اگرچہ پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ لیکن موقعہ کی مناسبت سے اس جگہ پر مختصر حوالہ دیا جاتا ہے:-

ایک مرتبہ جب الہ آباد میں لکھنؤ کے ایک قوال نے منیر کی غزل گائی اور نواب رامپور نے سنی تو ان کے کمال کے معترف ہو گئے اور اس شعر کے جواب میں جو منیر نے کہا تھا کہ:

میرے ہنر کا کوئی نہیں قدرداں منیر
شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

فی البدیہہ نواب صاحب نے فرمایا ؎

ناظم، منیر آئیے یہاں، ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

نواب رامپور نے صرف منیر کے شکوہ کا جواب ہی نہیں دیا بلکہ انھوں نے انڈمان سے منیر کو رہائی دلوانے میں بے حد کوشش کی اور رہائی کے بعد منیر رامپور ہی کی قدرداںیوں کے احسان مند رہے اور اپنے کمالات سے اہل سخن کو مستفیض کرتے رہے۔

اسی قسم کا ایک دوسرا قابل توجہ واقعہ یہ ہے کہ پہلی غزل جو منیر نے

عہدِ نوجوانی میں بغیر کسی استاد سے اصلاح لئے ہوئے آگرہ کے ایک مشاعرہ میں پڑھی تو اس نے ان کی ندرتِ فکر اور بلندیٔ خیال کو اہلِ فکر و فن کے سامنے ظاہر کر دیا اور وہ نوآموزوں کی صف سے استادوں میں شامل کر لئے گئے۔ بحثہ سنجوں اور اہلِ کمال نے منیرؔ کی اُمید سے زیادہ داد دی۔ نواب نظام الدولہ جو اس محفل میں شریک تھے، منشی منیرؔ کی نازک خیالی، شستگی زبان اور حسنِ بیان پر فریفتہ ہو گئے اور ان کو اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے۔ غزل کا مطلع ہے ؎

دنیا سے ہے باہر دلِ دیوانہ کسی کا
بستی میں سماتا نہیں ویرانہ کسی کا

مقطع ہے:-

عاشق ہوں منیرؔ اپنے ہی اندازِ سخن کا
وارفتہ کسی کا ہوں نہ دیوانہ کسی کا

اسی سلسلے میں ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو۔ ایک بار منیرؔ نے کانپور کے ایک مشاعرے میں وہ غزل پڑھی کہ جس کا مطلع ہے ؎

کیا جانیے کیا لطف ہے چلمن کے ادھر آج
جاتی ہے تو پھر کر نہیں آتی ہے نظر آج

تمام اہلِ مجلس بے حد متاثر ہوئے اور ان کے ایک ایک شعر کو بار بار پڑھوا کر داد دیتے رہے۔ نواب باندہ جو داد دینے والوں میں شامل تھے، منیرؔ کے کلام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے منیرؔ کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا اور اپنا استاد بنا لیا۔ مختصر اً جیسا کہ ان کی زندگی اور شاعری سے اندازہ ہوتا ہے۔ منیرؔ نے اپنے عہد کے ممتاز

استادوں سے فیض حاصل کرکے خود کو ایک استاد کے درجہ پر پہونچایا اور انکے
شاگردوں میں اس عہد کے ممتاز ادیب اور شعرا شامل ہوئے۔ منیر کی
اہمیت و عظمت مسلّم ہے اور وہ اپنے عہد کے باکمال اساتذہ میں سے تھے
اگرچہ مولوی عصمت اللہ النسخ شاگرد ناسخ نے اپنی کتاب " طومار اغلاط "
میں جن شعرائے لکھنؤ پر اعتراضات کئے ہیں ان میں منیر کو بھی شامل کیا ہے
لیکن اعتراضات کی سطحیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ
النسخ کی اس تنقید کی بدولت ان کے (منیر) کمال پر کوئی حرف نہیں آیا۔
اور وہ اسی طرح اپنے عہد کے اساتذہ میں ممتاز رہے۔

کسی شاعر کے کلام کا مکمل جائزہ اور تنقیدی مطالعہ کرنے پر یہ بات
روشن ہوجاتی ہے کہ اس کے کلام میں باوجود تمام خوبیوں کے کوئی نہ
کوئی کمزوری اور کچھ نہ کچھ خامی ضرور پائی جاتی ہوگی۔ منیر بھی کوئی فرشتہ نہ
تھے جو ان کے کلام میں کوئی خامی یا کمزوری نہ ہوتی۔ اس سلسلے میں منیر
کے مختلف اشعار منتخب کرکے ان پر جائز و ناجائز اعتراضات کئے گئے
ہیں مثلاً مولوی عصمت اللہ النسخ لکھتے ہیں :-

" فصل گل آتے ہی مبروص ہوئی لیلیٰ شب
قیس خفاش کی الفت میں نہ آجائے خلل

مصنف صاحب جب جدّت مضمون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں
تب ایسا ہی فرماتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کے ہزاروں
مہمل شعر ان کے دیوان میں موجود ہیں جن کی نسبت بہت سے
اہالیان لکھنؤ کو طرز شوکت بخاری کا گمان ہے۔ شعر

زہے تصور باطل زہے خیال محال "[111]

۱۱۱؎ طومار اغلاط۔ مولوی عصمت اللہ النسخ صفحہ ۴۲

حضرت النسخ کا منیر کے مندرجہ بالا شعر پر جو اعتراض ہے اور جس انداز سے انھوں نے اس اعتراض کو اہمیت دینے کی کوشش کی ہے وہ بالکل درست نہیں ہے۔ شعر کا مطلب بہ آسانی یہ لیا جا سکتا ہے کہ لال پھول دن کو کھلتے ہیں اور رات کو سفید پھول کھلتے ہیں۔ اس لئے شاعر نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ بہار آتے ہی ہر طرف جو سفید پھول کھلے ہیں۔ ان سے شب کو سفید داغوں کی بیماری ہو گئی ہے اور اندیشہ یہ ہے کہ چمگادڑ کو جو رات سے دل چسپی ہے اس میں کمی نہ آجائے اس زمانے میں اس طرح کی تشبیہات استعمال کی جاتی تھیں۔ مہمل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

طومار اغلاط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں منیر کی معنی آفرینی پر اعتراض ہے اور کہیں ترکیب الفاظ اور ترتیب خیالات پر۔ اوپر کی مثال ان کی معنی آفرینی کے سلسلے کی تھی۔ اب ترکیب اور استعمال محاورات پر کچھ اعتراضات ملاحظہ ہوں :-

(۱) " رکھتے ہیں اور صنعتوں میں بھی
تمہاری آغا علی نموداری
نموداری رکھنا نیا محاورہ ہے سند چاہیئے " [۱۱۲]

(۲) " حسین ایسے ہیں سقہ کہ وقت آب کشی
فروغ عکس سے یوسف نشیں بنا ہر ڈول
یوسف نشیں کی ترکیب ایجاد مصنف ہے سند چاہیئے۔ "

---

۱۱۲ و ۱۱۳ - طومار اغلاط - مولوی عصمت اللہ النسخ۔ صفحہ ۴۳

(۳) "غرض کہ رکھتی ہوں میں ہر غریب کا پردہ
تجھے بھی چاہیئے ہو دل سے میری منت دار
'منت دار' کی ایجاد مصنف ہے سند چاہیئے۔"[۱۱۴]

تو داری رکھنا' یا منت دار ہونا اگرچہ ایسا محاورہ ہے جو اس سے پہلے کسی کے یہاں انسخ کو نہیں ملا اور میرؔ ان کے پہلی مرتبہ استعمال کے ذمہ دار قرار دئے گئے لیکن یہ قابلِ اعتراض بات قرار نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح یوسف نشین کی ترکیب بھی اگرچہ نئی ہے لیکن ادبی معیار سے گری ہوئی نہیں معلوم ہوتی ہے نئی ترکیبوں اور جدت پسندیوں کو اگر ادبیات سے خارج کر دیا جائے تو ادب کی وسعتیں محدود ہو کر رہ جائیں اور اس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے۔

میرؔ کے کلام پر جو اس وقت کے تنقید نگاروں نے اعتراضات کیے ہیں۔ ان کی وجہ سے میرؔ کی عظمت یا اہمیت میں کسی طرح کی کمی نہیں آسکتی ہے۔ میرؔ تو استعارات اور تشبیہات، اصطلاحات، تلمیحات، کنایات، قدیم روایات، ادبی علامات اور تخیل کی بلند پروازیوں سے کام لیتے ہوئے بھی واقعات کو نہایت صفائی اور خوب صورتی سے بیان کر دیتے ہیں جو بآسانی ہر شخص کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ وہ ذہن میں کسی قسم کی الجھن پیدا نہیں ہونے دیتے ہیں۔ میرؔ نے غزلیات کے تین ضخیم دیوان چھوڑے ہیں۔ جن میں اشعار کی تعداد تقریباً سترہ ہزار ہے ظاہر ہے کہ اتنے اشعار میں کچھ کمزور شعر بھی مل سکتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی چھوٹی موٹی خامیوں یا کمزوریوں کی بدولت شاعر کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارے یہاں کی روایات تو یہ ہیں کہ پوری غزل میں اگر دو چار

---

۱۱۴۔ طومارِ اغلاط۔ عظمت اللہ انسخ۔ صفحہ ۵۴

شعر بھی بلند مرتبہ نکل آئیں تو وہ غزل نہایت کامیاب شمار کی جاتی ہے۔ اگر کوئی اعتراض کرنے پر آ جائے تو بڑے بڑے شعرا کے چند اشعار جو کچھ مبہم یا ناقابل فہم ہوں چن لے اور پھر ان اشعار کی بنیاد پر پورے کلام کو بے معنی کہنا شروع کر دے تو اس فعل کو کسی طرح مناسب یا دانشمندانہ اور قابل تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ اس قسم کے اعتراضات منیر پر بھی کیے گئے جو ان کی عظمت کو کم کرنے میں کسی طرح کامیاب نہیں کہے جا سکتے ہیں:

منیر کے کلام میں غزلوں کے بعد جو دوسری قابل توجہ چیز نظر آتی ہے وہ انکے قصائد کی شان و شوکت اور ان کے حالات زندگی کے اشارے ہیں جو ان میں پائے جاتے ہیں اور غزلوں سے زیادہ ان کی شہرت اور عظمت کے ذمہ دار قرار دیے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے تاریخی قطعات میں اپنے معاصرین اور معاصرانہ واقعات کو نظم بند کر کے اپنی مشق تاریخ گوئی اور واقعہ نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مکمل شاعر، زمانہ شناس، تاریخ نگار، داستان گو، نقاد اور ادیب نظر آتے ہیں وہ جس عظمت کے مستحق تھے ہمارے ادب کے تاریخ نگاروں یا نقادوں نے ان کو وہ مقام اب تک نہیں دیا ہے۔ جس کی ذمہ داری زیادہ تر ان حالات پر ہے۔ جن میں منیر نے اپنی زندگی گزاری۔ ان کے کلام کا تجزیہ یقینی طور پر ایک حقیقت پسندانہ نگاہوں کا مستحق ہے اور ان کے کلام کا انتخاب اپنے عہد کی تمام ادبی تحریکوں، سیاسی تبدیلیوں، سماجی الجھنوں، معاشرتی اصلاحوں، مذہبی رجحانات کی بڑی طرح آئینہ داری کرتا اور ان کو ہر لحاظ سے ہمارے اردو ادب کا ایک عظیم المرتبت شاعر قرار دیتا ہے۔

# کتابیات

(الف) غیر مطبوعہ کتابیں۔

۱۔ سنانِ دل خراش (تنقیدی کتاب) مصنف۔ میر شکوہ آبادی
(لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور۔ لائبریری)

۲۔ داستانِ طلسم گوہربار۔ مصنف۔ میر شکوہ آبادی۔
(گورنمنٹ لائبریری رام پور)

(ب) مطبوعہ کتابیں :

۱۔ اردو کی ادبی تاریخ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (پہلا اڈیشن ۱۹۵۸ء)

۲۔ اُردو غزل کے پچاس سال حالی تا اکبر۔ ڈاکٹر عبدالاحد خان خلیل۔
(پہلا اڈیشن دسمبر ۱۹۶۱ء)

۳۔ اُردو ادب میں قومی شاعری کے سو سال مصنف علی جواد زیدی
(جنوری ۱۹۵۹ء)

۴۔ ادب اور ادیب۔ ڈاکٹر اعجاز حسین
(بار اول ۱۹۶۰ء اسرار کریمی پریس الہ آباد)

۵۔ ادب اور نظریہ۔ مصنف آل احمد سرور
(سرفراز قومی پریس۔ نادان محل لکھنؤ ۱۹۵۴ء)

۶۔ اردو تنقید کی تاریخ۔ مصنف مسیح الزماں لکچرار الہ آباد یونیورسٹی)
(پہلی جلد اکتوبر ۱۹۵۴ء)

۷۔ اردو غزل کی نشوونما۔ ڈاکٹر رفیق حسین (بار اول ۱۹۵۴ء)

۸۔ اردو میں قصیدہ نگاری مصنف ابو محمد سحر (جون ۱۹۵۸ء)

۹۔ اردو ادب آزادی کے بعد مصنف ڈاکٹر اعجاز حسین (۱۹۶۰ء)

۱۰۔ ۱۸۵۷ء کے غدار شعراء مصنف امداد صابری (۱۹۶۰ء)

۱۱ امیر مینائی مصنفہ ممتاز علی آہ

۱۲۔ ایام غدر اور اس کے بعد چند مدت کے دلی کے متفرق حالات
باب ششم (لکھنؤ یونیورسٹی)

۱۳۔ بحر الفصاحت مصنف نجم الغنی خاں (بار اول ۱۹۱۷ء)

۱۴۔ بزم داغ ۔ مصنف سید رفیق مارہروی

۱۵۔ تنویر الاشعار ۔ دیوان دوم منیر شکوہ آبادی
(دوسرا ایڈیشن ۱۳۲۵ھ مطبع سعیدی رام پور)

۱۶۔ تاریخ قصائد اردو ۔ مصنف حافظ جلال الدین جعفری زینبی

۱۷۔ تنقید لکھنؤ ۔ ہفت روزہ ایڈیٹر نسیم انصاری لکھنوی (رسالہ)

۱۸۔ تذکرہ شعراء اردو ۔ موسوم بہ گل رعنا ۔ مولانا سید عبد الحئی
(طبع چہارم ۱۳۷۰ھ)

۱۹۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مصنف ڈاکٹر تارا چند ۔ مترجمہ خورشید مصطفیٰ رضوی ۔ (اپریل ۱۹۵۹ء)

۲۰۔ حرف غزل ۔ مصنف پروفیسر مسیح الزماں (پہلی اشاعت ۱۹۵۷ء)

۲۱۔ دربار حسین المعروف بہ چراغ مجالس افضل حسین ثابت ۔

۲۲۔ دلی کا دبستان شاعری ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۔ ۱۹۴۹ء

۲۳۔ رسالہ آجکل دہلی ۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۹ء

۲۴۔ رسالہ اردوئے معلی بابت فروری ۱۹۰۵ء مرتبہ حسرت موہانی ۔

۲۵۔ رسالہ اردوئے معلی بابت اپریل ۱۹۰۵ء مرتبہ حسرت موہانی
۲۶۔ سودا۔ شیخ چاند
۲۷۔ طومار اغلاط۔ مولوی عصمت اللہ فصیح
(۱۲۹۷ھ در مطبع میڈیکل پریس آگرہ)
۲۸۔ غدر کی صبح و شام۔ خواجہ حسن نظامی۔ (مارچ ۱۹۲۶ء پہلا اڈیشن)
۲۹۔ غدر کے چند علماء۔ انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی
(شائع کردہ۔ نیا کتاب گھر اردو بازار دہلی)
۳۰۔ غزل و مطالعہ غزل۔ عبادت بریلوی۔
شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۵۵ء کراچی)
۳۱۔ FREEDOM ON STRUGGLE IN UTTAR PRADESH VOL. IV.
۳۲۔ کلیات منیر۔ (مطبع نامی گرامی ثمر ہند واقع لکھنؤ ۱۲۹۶ھ)
۳۳۔ لکھنؤ اور جنگ آزادی۔ ادبی اکیڈمی لکھنؤ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
(بار اول ۱۹۵۷ء)
۳۴۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج۔ مصنفہ سید مسعود حسن رضوی ادیب
(پہلی چھاپ ۱۹۵۷ء)
۳۵۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج۔ مصنفہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔
(پہلی چھاپ ۱۹۵۷ء)
۳۶۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی (طبع اول ۱۹۴۴ء)
۳۷۔ لکھنؤ کی آخری شمع۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی
(۱۹۵۴ء) ایجوکیشنل بک ہاؤس (علی گڑھ)

۳۸۔ مختصر تاریخ اردو ادب۔ اعجاز حسین نظیر لدھیانوی ۱۹۵۳ء بار اول)
۳۹۔ مثنوی معراج المضامین۔ مصنف منیر شکوہ آبادی
(مطبع گلشن باقری لکھنؤ۔ دوسرا ایڈیشن ۱۳۱۲ھ)
۴۰۔ مثنوی حجاب زناں۔ مصنف منیر شکوہ آبادی
۴۱۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ حالی۔ تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء
۴۲۔ مثنوی سراپا سوز محمد صادق اختر۔ مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
(ناشر مکتبۂ کلیاں ۱۹۶۱ء)
۴۳۔ مسدس تہنیت جشن بے نظیر۔ مصنفہ میر یار علی جان صاحب۔
مرتبہ محمد علی خاں اثر رامپوری (طبع اول ۱۹۵۰ء)
۴۴۔ منتخب العالم۔ دیوان اول منیر شکوہ آبادی
(دوسرا ایڈیشن ۱۳۲۳ھ مطبع سعیدی رامپور)
۴۵۔ مثنویات۔ امیر احمد علوی (۱۹۳۶ء)
۴۶۔ نثر ریاض خیر آبادی، مضامین و خطوط کا مجموعہ۔ عقیل احمد جعفری
۴۷۔ نظم منیر۔ دیوان سوم منیر شکوہ آبادی
(پہلا ایڈیشن ۱۲۹۶ھ مطبع سعیدی رامپور)
۴۸۔ نگار نمبر۔ دسمبر ۱۹۵۷ء۔ نیاز فتحپوری (رسالہ)
۴۹۔ نگار نمبر جنوری فروری ۱۹۴۷ء (رسالہ)
۵۰۔ ہماری داستانیں۔ سید وقار عظیم۔ (ادارہ فروغ اردو۔ لاہور ۱۹۵۹ء)

# نسیم بکڈپو لکھنؤ کے شائع کردہ چند ادبی کتب

(مفصل فہرست کتب طلب فرمائیں)

| | | |
|---|---|---|
| انتخاب قصائد اردو | ڈاکٹر ابو محمد سحر | 8/- |
| مطالعہ امیر | " | 8/- |
| اردو میں قصیدہ نگاری | " | 4/- |
| مکاتیب امیر مینائی | مرتبہ:- احسن اللہ خاں ثاقب | 6/- |
| جلوۂ احسن | کلام احسن مارہروی | 2/50 |
| ناول کیا ہے | ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی و ڈاکٹر احسن فاروقی | 3/50 |
| مقالات ظہیری | اختر علی تلہری کے ادبی مضامین | 2/50 |
| رہنمائے شاعری (اول، دوم) | انقر موہانی | -/75 و -/75 |
| مضامین ہفت رنگ | ڈاکٹر آفتاب اختر | 2/50 |
| مرآۃ الغیب | دیوان امیر مینائی | 4/50 |
| اردو کے ادبی معرکے | امیر حسن نورانی | 2/50 |
| معرکۂ چکبست و شرر | " " | 6/75 |
| خیر المجالس | ملفوظات خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی | 6/- |
| مشکلات غالب | نیاز فتحپوری | 2/50 |
| نگارستان | " | 4/- |
| دبستان دبیر | ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی | 10/- |
| داستانے چند | راز چاند پوری | 2/- |
| زبان داغ | داغ دہلوی کے خطوط | 3/50 |
| ادبی اشارے | ڈاکٹر سلام سندیلوی | 4/50 |

| | | |
|---|---|---|
| غالب کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ | ڈاکٹر سلام سندیلوی | 10/- |
| اردو رباعیات | " | 12/- |
| اردو شاعری میں منظر نگاری | " | 10/- |
| شاد عظیم آبادی کلام و شرح | مرتبہ : نقی احمد ارشاد | 8/- |
| مخزن الاسرار | کلام حضرت شاہ جی خدا نما | 2/- |
| سب رس | ملا وجہی مرتبہ شمیم انہونوی | 5/50 |
| مضامین فرحت اول | مرزا فرحت اللہ بیگ | 3/- |
| نیرنگ خیال | محمد حسین آزاد مرتبہ شمیم انہونوی | 1/50 |
| باقیات غالب | وجاہت علی سندیلوی | 3/- |
| دو ادبی اسکول | علی جواد زیدی | 7/- |
| خطوط مشاہیر | مرتبہ مولانا عبد الماجد دریابادی | 5/- |
| پنجاب میں اردو | محمود شیرانی | 5/- |
| دکن میں اردو | نصیر الدین ہاشمی | 15/- |
| ہمارے نثر نگار | سید صفی مرتضیٰ | 1/75 |
| چند ممتاز شعرا | " | 1/75 |
| اردو نثر میں ادب لطیف | ڈاکٹر عبد الودود | 8/- |
| فیض میر | مسعود حسن رضوی ادیب | 1/50 |
| ہندوستانی لسانیات | ڈاکٹر محی الدین قادری زور | 3/- |
| دیدۂ بینا | کوثر چاندپوری کے ادبی مضامین | 4/- |
| اردو غزل کے پچاس سال | ڈاکٹر عبد الاحد خاں خلیل | 7/50 |
| نظابیات | عبد القوی دسنوی | 6/- |